جون ۲۰۱۸ء ۱۵ روپئے

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں کی تاریخ پیدائش (جون)

وہاب اشرفی

شہاب جعفری

شبلی نعمانی

سیماب اکبرآبادی

گوپال متل

شمیم کرہانی

محمد حسین آزاد

وارث علوی

مغنی تبسم

ابواللیث صدیقی

شہریار

سلمیٰ صدیقی

کنہیالال کپور

مجید امجد

نثار احمد فاروقی

احمد جمال پاشا	یکم جون ۱۹۳۶	۲۸/ستمبر ۱۹۸۷
وہاب اشرفی	۲/جون ۱۹۳۶	۱۵/جولائی ۲۰۱۲
شہاب جعفری	۲/جون ۱۹۳۰	یکم فروری ۲۰۰۲
شبلی نعمانی	۴/جون ۱۸۵۷	۱۸/نومبر ۱۹۱۴
پنڈت رتن ناتھ سرشار	۵/جون ۱۸۸۲	۲۷/جنوری ۱۹۰۲
سیماب اکبرآبادی	۵/جون ۱۸۸۲	۳۱/جنوری ۱۹۵۱
گوپال متل	۷/جون ۱۹۰۶	۱۵/اپریل ۱۹۹۳
خواجہ احمد عباس	۷/جون ۱۹۱۴	۳۱/مئی ۱۹۸۷
شمیم کرہانی	۸/جون ۱۹۱۳	۱۹/مارچ ۱۹۷۵

محمد حسین آزاد	۱۰/جون ۱۸۳۰	۲۲/جنوری ۱۹۱۰
عبدالرحمن بجنوری	۱۰/جون ۱۸۸۵	۷/نومبر ۱۹۱۸
ابن انشاء	۱۰/جون ۱۹۲۷	۱۱/جنوری ۱۹۷۸
وارث علوی	۱۱/جون ۱۹۲۸	۹/جنوری ۲۰۱۴
نازش انصاری	۱۲/جون ۱۹۴۸	۱۲/جون ۲۰۰۳
مغنی تبسم	۱۳/جون ۱۹۳۰	۱۵/فروری ۲۰۱۲
احمد رضا خاں بریلوی	۱۴/جون ۱۸۵۶	۲۸/اکتوبر ۱۹۲۱
شاہ عالم ثانی	۱۵/جون ۱۷۲۸	۱۹/نومبر ۱۸۰۶
ابواللیث صدیقی	۱۵/جون ۱۹۱۶	۷/ستمبر ۱۹۹۴

عزیز حامد مدنی	۱۵/جون ۱۹۲۴	۲۳/اپریل ۱۹۹۱
اظہار اثر	۱۵/جون ۱۹۲۸	۱۵/اپریل ۲۰۱۱
شہریار	۱۶/جون ۱۹۳۶	۱۳/فروری ۲۰۱۲
قیصر حیدر دہلوی	۱۷/جون ۱۹۲۸	۹/فروری ۱۹۹۴
سلمیٰ صدیقی	۱۸/جون ۱۹۳۱	۱۳/فروری ۲۰۱۷
کنہیالال کپور	۲۷/جون ۱۹۱۰	۱۸/مئی ۱۹۸۰
مجید امجد	۲۹/جون ۱۹۱۴	۱۱/مئی ۱۹۷۴
نثار احمد فاروقی	۲۹/جون ۱۹۳۴	۲۸/نومبر ۲۰۰۴

بشکریہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

جلد: ۷۳ شمارہ: ۲

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

جون ۲۰۱۸ء

پبلشر: ڈاکٹر اجول کمار

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر

سہیل وحید

فون: 9415007694

Ph. No. 2239132 Ext. 228

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن و زر سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار: وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اتر پردیش

زر سالانہ: ۱۶۵/روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

مرزا جعفر حسین
تعلیم و تربیت اطفال
صفحہ ۴۳

انتون چیخوف
اذیت
صفحہ ۵۲

اقبال مجید
اپنے اپنے طوطے
صفحہ ۱۹

آصفہ زمانی
غزل
صفحہ ۱۸

احمد ابراہیم علوی
'ہماری آواز' سے 'نیا دور' تک کا سفر
صفحہ ۳

شہپر رسول
غزل
صفحہ ۱۸

سلمان علی خاں
نیا دور کے پیشرو اخبار و جرائد
صفحہ ۷

انیس رفیع
ایک اور برزخ
صفحہ ۲۶

خورشید حیات
سورج ابھی جاگ رہا ہے
صفحہ ۲۹

پرویز شہریار
بچپن کا ایک خواب
صفحہ ۳۵

نصرت ظہیر
پہلا روزہ اور رمضان کی کچھ یادیں
صفحہ ۵۸

کیتو وشنا تھ ریڈی
پنج خانہ
صفحہ ۴۶

راج موہن جھا
ہمدردی
صفحہ ۵۵

فضل الرحمن اصلاحی
ملک زادہ منظور احمد بحیثیت اداریہ نگار
صفحہ ۱۶

نیا دور کی تاریخ

تاریخ اپنے آپ میں نہایت وسیع عمل کا جواز رکھتی ہے۔ ازل سے ابد تک یہ عمل ہزاروں لاکھوں سال سے جاری وساری ہے۔ یہ سلسلہ رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ جب تک انسان ہے اس کی تاریخ رقم ہوتی رہے گی۔ تاریخ کے معاملات بیحد پیچیدہ لیکن پر کشش بھی ہوتے ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی انسان کے نظریہ اور وژن کی نشوونما کرتی ہے۔

تاریخ Precedence اور Contidions Present کو ملا کر Conditions Sub sequent کا نام ہے۔ جو گزر چکا ہے وہ حال کے لئے کیا معنی رکھتا ہے اور ماضی سے ہم نے کیا سبق لیا کہ مستقبل تابناک رہے۔ بظاہر تاریخ کا مطالعہ یہی درس دیتا ہے لیکن در حقیقت تاریخ ہمارے اجداد کی حاصل شدہ ورثہ کو تجدید نو کی تحریک بھی دیتی ہے۔ ہم نے نیا دور کی ادارت سنبھالنے کے بعد اس رسالے کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھا اور ان تمام لوگوں سے اس بارے میں گفتگو کی جو نیا دور سے وابستہ رہے ہیں۔ کچھ کتابوں سے بھی استفادہ کیا اور 'نیا دور' کے ان تمام شماروں کی ورق گردانی بھی کی جو دستیاب ہیں۔ ہماری امیدوں کے برخلاف نیا دور کی تاریخ مرتب کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ چیدہ چیدہ مضامین جو نیا دور کے نصف صدی نمبر میں شائع ہوئے یا کبھی دوسرے موقعوں پر لکھے گئے، انہیں سے ہم نے نتیجہ اخذ کیا کہ نیا دور کی تاریخ کم وبیش تقریباً پچانوے سال پر محیط ہے۔ اسی لئے ہم نے 'نیا دور' کے سرورق پر اس کی سن تاریخ تحریر کرنے کو بھی ضروری سمجھا۔

آج 'نیا دور' جس صوری اور معنوی حسن سے مزین ہے یہ انہیں تجربات کا اعلامیہ ہے۔ چونکہ اس کی بنیاد میں مشاہیر دانشوروں اور قلمکاروں کی عرق ریزی کا بہت بڑا عمل دخل رہا ہے۔ یہ وہ میراث ہے جس کی ذمہ داری اپنے سر لینا اپنے آپ میں ایک بہت بڑا کمٹمنٹ ہے۔ بات وہاں سے نکلتی ہے جب ریاست اتر پردیش بھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ ان دنوں حکومت کی باگ ڈور آگرہ سے سنبھالی جاتی تھی۔ فرنگیوں کے مزاج میں مکالمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، بظاہر خاموش طبع فرنگی اپنی بات کہنے کے لئے کوئی نہ کوئی وسیلہ تلاش کرنے کے ماہر ہوتے ہیں اور یہ عمل آج بھی جاری ہے کہ روز بروز ترسیل کے نئی نئی تکنیک کبھی واٹس اپ اور کبھی دوسری شکلوں میں سامنے آ رہی ہے۔

بات آگرہ پریسی ڈنسی سے شروع ہوئی تھی تو قابل ذکر یہ ہے کہ آگرہ اخبار کیونکر وجود میں آیا اور کتنے دن قائم رہا۔ اس کے نشانات باقیات کے طور پر بھی موجود نہیں ہیں

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیا دور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ کے لئے پوسٹ کئے جا رہے ہیں۔

لیکن صحافت پر مبنی مختلف کتابوں میں آگرہ اخبار کا ذکر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہی وہ پہلا رسالہ جو اخبار کی شکل میں تھا جسے انگریز حکمران نے ۱۹۲۲ء میں شروع کیا تھا۔ ہندوستانی عوام نے زمام حکومت انگریزوں کے ہاتھوں سے چھین کر خود سنبھال لی، لیکن سرکاری نظام کی تمام ضروریات اپنے وجود کو قائم رکھتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی گئیں اور الگ الگ شکلیں بھی اختیار کرتی گئیں۔ موجودہ سرکاری سسٹم کا اگر انگریزوں کے زمانے کے دفتری نظام سے موازنہ کیا جائے تو زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا۔ آگرہ اخبار کے بعد 'ہماری آواز' پھر 'اطلاعات' سے اتر پردیش ہوتے ہوئے 'نیا دور' کی تشکیل کا عمل بھی اسی تاریخی وراثت کا جزو لاینفک ہے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے درمیان ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے 'نیا دور' سے قبل محکمۂ اطلاعات اور اتر پردیش حکومت کے ذریعہ شائع ہونے والے ان رسالوں کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ انہیں ایک اہم دستاویز کی طرح محفوظ بھی کر رکھا ہے۔ جناب سلمان علی خاں چونکہ زمانہ دراز تک محکمۂ اطلاعات سے وابستہ رہے ہیں اور اردو صحافت کی تاریخ پر ان کی خاصی نگاہ بھی ہے، انہوں نے ہماری گزارش کو تسلیم کرتے ہوئے 'نیا دور' اور اس کے اہم

جون ۲۰۱۸ء سے 'نیا دور' کی قیمت
۱۵ روپے فی شمارہ کے جزوی اضافے کے ساتھ
زر سالانہ ۱۶۵ روپے معین کیا گیا ہے

عصر اخبار و رسائل کے مختصر تعارف اور تاریخ پر سیر حاصل مضمون لکھا۔

اردو روزنامہ 'آگ' کے ایڈیٹر اور مشہور صحافی جناب احمد ابراہیم علوی صاحب کے بھی ہم بیحد ممنون ہیں کہ انہوں نے 'نیا دور' سے متعلق اپنی تمام معلومات کو ایک مضمون کی شکل دیتے ہوئے 'نیا دور' سے پیشتر نکلنے والے رسائل کی نشاندہی کی۔ ان کے پاس 'ہماری زبان' کے کئی شمارے خستہ حالت میں موجود ہیں۔ 'نیا دور' سے ان کے تعلق اور اردو صحافت کو اوڑھنا بچھونا بنا چکے علوی صاحب اس قسم کے بیش بہا صحافتی سرمایہ محفوظ کئے ہوئے ہیں۔

ہندوستانی ادب میں لیجنڈ کی حیثیت رکھنے والے اردو طنز ومزاح کے شہنشاہ مجتبیٰ حسین پر 'نیا دور' جلد ہی ایک شمارہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کا اعلان بھی ہم مئی ۲۰۱۸ء کے شمارے میں کر چکے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی طرحدار شخصیت اور تہہ دار تحریروں پر مضامین درکار ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ 'نیا دور' اپنے تمام سابقہ شماروں کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے مجتبیٰ حسین نمبر بھی شائع کرے گا۔ ہم نے ساقی فاروقی اور فضیل جعفری پر بھی ایک پورا شمارہ مرکوز کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ان شماروں کے لئے بھی مضامین کی درخواست ہے لیکن مضامین گھسے پٹے انداز میں روایتی پیٹرن پر ہونے کے بجائے جدید دور کے تقاضوں سے مناسبت ضرور رکھتے ہوں۔

جون ۲۰۱۸ء سے 'نیا دور' کی قیمت ۱۰ روپے کے بجائے پندرہ روپے فی شمارہ کی جارہی ہے۔ اس اعتبار سے زر سالانہ ۱۶۵ روپے طے کیا گیا ہے۔ کاغذ، چھپائی، کوئیر، ڈاک اور دیگر اخراجات میں گزشتہ برسوں میں بے تحاشا اضافہ ہوا لیکن نیا دور کی قیمت میں نہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ قارئین نیا دور اس معمولی سے اضافہ کو بار خاطر نہیں محسوس کریں گے۔ جن قارئین کا زر سالانہ جمع ہے، ان کی مدت اضافہ شدہ قیمت کے اعتبار سے شمار کی جائے گی نیز ایجنسیوں کے کمیشن میں کسی طرح کا ردوبدل نہیں کیا گیا ہے۔

اس مرتبہ تبصرے والے کالم میں اہم تخصیص کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں موصول ہونے والی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے لہٰذا ایسی صورت میں تمام کتابوں پر تبصرہ کروانا انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لئے اس بار ادارۂ 'نیا دور' دستیاب ہونے والی کتابوں میں سے شعری مجموعوں کا انتخاب کر کے اس پر تبصرہ شائع کر رہا ہے۔

نیا دور کے سرورق کے اندرونی حصے پر مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ ولادت و وفات سے متعلق شائع ہونے والا جدول قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کلینڈر سے ماخوذ ہے لہٰذا تاریخی اغلاط کے لئے 'نیا دور' کسی طرح کا ذمہ دار نہیں ہے۔ قارئین 'نیا دور' کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا مئی ۲۰۱۸ء www.information.up.nic.in پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

ہماری آواز 'اطلاعات' بنا اور پھر 'نیا دور' ہو گیا

احمد ابراہیم علوی
ایڈیٹر روزنامہ 'آگ'، ڈالی باغ لکھنؤ
رابطہ: 0522-2204567

حقیقت یہ ہے کہ حالات اتنے خراب نہیں ہیں جتنے بتائے جارہے ہیں۔ اسی لئے جو کچھ نہیں کرنا چاہتے ہیں وہ دوسروں کو بھی کچھ نہ کرنے دینا چاہتے ہیں تاکہ انہیں کوئی برا نہ کہہ سکے پھر بھی جو کچھ کرنے کا عزم رکھتے ہیں وہ اپنی کوششیں جاری رکھتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔

حالات بدلتے رہتے ہیں۔ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے۔ ایسے میں خود کو حالات سے نبرد آزما ہونے کا موقع ملتا ہے تب غلط فہمیوں اور خوش فہمیوں سے گریز کرتے ہوئے اپنے عزم کے مطابق سب کچھ کرنے کا جذبہ تقویت حاصل کرتا ہے۔

پرانے طور طریقے چھوڑ کر نئے حالات کے مطابق اگر صحافت سے مستفید ہونے کی کوشش ہو تو کامیابی یقینی ہوگی۔ جدید تقاضوں اور کاروبار کے اصول وضوابط کو پیش نظر رکھ کر کوئی اخبار نکالا جائے یا رسالہ شروع کیا جائے تو یقینا کامیابی ہوگی۔ اچھے مقاصد بھی طرح کے قارئین کی پسند اور ناپسند، بازار کی ضرورت مگر اپنے نظریات کو بہرحال عزیز رکھتے ہوئے جو بھی رسائل نکالے جائیں گے وہ یقینا عوام میں مقبولیت حاصل کریں گے اور تجارتی اعتبار سے بھی فائدہ پہنچائیں گے۔ بس کوشش شرط ہے۔

اردو زبان کی تاریخ میں خوشحالی کا کوئی ایسا دور اب تک نہیں آیا جس میں مصنفین اور صحافیوں کو آسودگی میسر رہی ہو۔ اردو کے مصنفین نے ہمیشہ خون جگر سے زبان و ادب کی آبیاری کی ہے۔ انہیں لکھنے پڑھنے، چھپنے اور قارئین تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے وہ وسائل کبھی حاصل نہیں رہے جو کہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ادیبوں کو حاصل رہتے ہیں۔ اچھی اچھی کتابوں اور اخبارات و رسائل تک کو اتنی بڑی تعداد میں قارئین نہیں مل پاتے ہیں کہ کتب و اخبارات کی

فروخت سے تمام ضرورتیں بحسن وخوبی پوری ہوسکیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر لکھنؤ کے ماہنامہ 'نیا دور' کی اشاعت کے ۷۲ سال پورے ہونے پر حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔

اردو کے اخبارات اور رسائل کیوں مقبول نہیں ہو پاتے، وہ کیوں نہیں دراز عمر پاتے، اس کے متعدد اسباب ہیں۔ ان میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ زیادہ تر اخبارات اور رسائل وقتی ضرورتوں یا پھر کاروباری اغراض سے ان لوگوں کے ذریعہ نکالے جاتے ہیں جن کا علم و ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، اس سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ایک اقتباس بڑا مفید اور دلچسپ ہے۔

'اردو اخباروں اور رسالوں کے موجودہ مذاق کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان، اس کے ادب، شاعری، تنقید اور اسالیب کی نشوونما اور فروغ میں سب سے زیادہ حصہ اخباروں اور رسالوں کا ہے۔ اول تو کتابیں ہمارے یہاں لکھی ہی کم جاتی ہیں۔ شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد اور بھی کم ہوتی ہے پھر ان کتابوں کے پڑھنے والے اور بھی کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے اسباب بہت سے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر سال جتنے مضامین لکھے جاتے ہیں اور اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں ان کی اور ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں ہر طرح کے اخبار اور رسالے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں صرف کاغذی چیتھڑے کہنا چاہئے اور بقول ہمارے ایک دوست کے، کتب خانوں اور الماریوں میں محفوظ کرنا تو درکنار، اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ غسل خانے کی زینت بن سکیں۔ ان میں بعض صرف نعروں پر زندہ ہیں اور بعض پرانی قبروں کے مجاور ہیں۔ بعض گفتہ اور ناگفتہ مردانہ اور زنانہ جنسی بیماریوں کے علاج اور قوت مردی کی دواؤں کے اشتہارات کی برکت سے زندہ ہیں۔ ان اشتہاروں کو پڑھ کر بہتوں کا بھلا ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو لیکن ان کے

شائع کرنے والوں کا بھلا ضرور ہوتا ہے۔ کچھ رسالے ارباب سیاست، ارکان سیاست اور سیاسی قیموں کی سرپرستی سے زندہ ہیں۔ انہیں سرکاری اشتہارات ملتے ہیں۔ ان کے پرچوں کی ایک بڑی تعداد مفت تقسیم کرنے اور ردی میں بیچنے کے لئے خریدی جاتی ہے۔'

(ماہنامہ نگار، نیاز نمبر دوم ۱۹۶۳ء، پاکستان مضمون، نیاز اور نگار)

اردو میں اخبارات اور رسائل کے نکلنے اور بند ہونے کی روایت بڑی پرانی ہے۔ اسی لئے جب کوئی اچھا اخبار یا رسالہ نکلتا ہے تو لوگ بجائے خوش ہونے کے غمگین ہوتے ہیں کہ یہ اپنے محدود وسائل کے سبب زیادہ نہ چل سکے گا۔ ہوتا بھی یہی ہے۔ 'تہذیب الاخلاق'، 'مخزن'، 'ریاست'، 'نگار'، 'ہمایوں'، 'ندیم'، 'زمانہ' اور 'آئینہ' جیسے ہر اعتبار سے معیاری اور قابل قدر اخبارات و رسائل بھی زیادہ زندگی نہ پا سکے۔

'تہذیب الاخلاق' وہ رسالہ تھا جس نے اردو زبان میں ہر طرح کے مضامین اور مباحث کی بنا ڈالی۔ سرسید احمد خاں نے اس رسالے کے ذریعہ اردو زبان کو وسعت خیال و اظہار عطا کی اور آج جو ہم ہر موضوع پر طرح طرح کے مضامین اردو میں پڑھتے ہیں وہ اسی کے رہین منت ہیں۔

'مخزن' شیخ عبد القادر کا وہ معیاری رسالہ تھا جس کے ذریعہ انہوں نے نہ صرف جلیل القدر شخصیتوں کے خیال و افکار کو شائع کیا بلکہ شخصیتوں کو بنایا، نکھارا اور بام عروج پر پہنچایا۔ 'ہمایوں' معیاری ادب پیش کرنے والے رسائل کا سرخیل کارواں رہا ہے، 'ریاست' کو پابندی وقت سے نکالنے اور معیاری و معتبر بنائے رکھنے کے لئے کہنا چاہئے۔ سردار دیوان سنگھ مفتون نے اپنی ریاست ہی ختم کردی۔ 'نگار' اپنی علمی و ادبی دھونس کے باوجود نیاز فتحپوری کو ترک وطن سے باز نہ رکھ سکا، 'زمانہ' کو منشی دیا نرائن نگم اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے عہد کے تمام قابل قدر ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی خدمت حاصل کرنے کے باوجود لمبی عمر نہ دلا سکے۔ 'آئینہ' کو ماہنامہ 'شمع' کے

مالکان کی تمام صلاحیتیں، رسائل اور تجربے بھی زندہ رہنے کی صلاحیت نہ عطا کر سکے۔ علی گڑھ سے پندرہ روزہ 'خیر و خبر' کو انگریزی صحافت کے معیار کے مطابق

فہرست مضامین

ہماری آواز

الہ آباد

جلد ۳

اڈیٹر کی میز

نکالا گیا۔ اس کو ایک بڑے گھرانے کی سرپرستی حاصل ہوئی اور اس رسالے نے جرائم نمبر، کینسر نمبر، دیو بند نمبر، کرکٹ نمبر، الیکشن نمبر جیسے خاص نمبر شائع کئے اور بڑا نام پیدا کیا پھر بھی یہ تین سال سے زیادہ کی زندگی حاصل نہ کر سکا۔

گیا (بہار) سے نکلنے والا 'ندیم' بہار کا بڑا ہی معیاری رسالہ تھا۔ اس میں جلیل القدر ادیب اور شاعر نمودار ہوتے تھے۔ بڑی اہم بحثیں اس کے صفحات میں بکھری پڑی ہیں لیکن یہ بھی طویل عمر نہ پا سکا۔ حیدر آباد دکن میں سلیمان اریب کی ادارت میں نکلنے والے 'صبا' نے بھی بڑا وقار حاصل کیا اور اس میں شائع ہو جانا بڑے بڑے ادیبوں کا کمال فن سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے سبب سلیمان اریب کی تنگ دستی بڑھتی رہی اور بالآخر انہوں نے دم توڑ دیا اور رسالہ بھی بند ہو گیا۔

بنگلور سے ماہنامہ 'نیا دور' محمود ایاز اور ممتاز شیریں کی ادارت میں بڑی آب و تاب سے نکلا اور ہند و پاک کے انتہائی معیاری رسائل میں شمار ہوا لیکن جلد ہی دم توڑ گیا۔

لکھنؤ کا ماہنامہ 'نیا دور' اپنی زندگی کے ۷۲ سال بخیر و خوبی تمام کر کے مزید تب و تاب اور جاہ و جلال سے نکل رہا ہے تو اس پر خوشی سے زیادہ حیرت ہو رہی ہے۔ اگر ان لوگوں کی مساعی جمیلہ کو بہ نظر تحسین نہ دیکھا جائے تو صریحاً ناانصافی ہوگی جنہوں نے شروع ہی سے نیا دور کو حکومت وقت کا ڈھنڈورچی بنانے کے بجائے زیادہ سے زیادہ علمی و ادبی اور معلوماتی باوقار رسالہ بنانے کی کوشش کی تو اس سلسلہ میں حکومت اتر پردیش اور اس کے محکمہ اطلاعات کو بھی داد دینا ضروری ہوگا جس نے کبھی نیا دور کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت نہیں کی بلکہ اس کو بڑی خوشی سے ایک آزاد خیال معیاری ادبی رسالہ بنتے دیکھ کر اظہار مسرت ہی کیا۔ محکمۂ اطلاعات کے وہ افسران بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے نیا دور کی ادبی اور علمی معیار کو قائم رکھنے میں شاید کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔

یہ بات اس لئے مزید قابل تعریف ہے کہ

ہندوستان کی ہر ریاست سے ایک سرکاری اردو اخبار یا رسالہ ضرور نکلتا ہے جیسے دہلی سے 'دلی'، آندھرا پردیش سے 'آندھرا پردیش' بہار سے 'بہار کی خبریں' کشمیر سے 'شیرازہ' پنجاب سے 'پاسبان' وغیرہ لیکن ان میں اس کسی کی وہ ادبی حیثیت نہیں جو حکومت اتر پردیش کے اردو ماہنامہ 'نیا دور' کی ہے جب کہ سب کو کم و بیش وہی سہولیات حاصل ہیں جو کہ نیا دور کو حاصل رہی ہیں۔

قابل ذکر امر یہ بھی ہے کہ نیا دور اپنے موجودہ نام اور ہیئت کے ساتھ ۷۲ سال پورے کر چکا ہے، لیکن یہ رسالہ اس سے پہلے 'اتر پردیش'، 'اطلاعات' اور 'ہماری آواز' کے نام سے بھی نکلتا رہا ہے۔

آزادیٔ وطن سے پہلے جب برطانوی حکومت تھی اور اتر پردیش صوبۂ متحدہ ہوا کرتا تھا اس کا سیاسی دار السلطنت الٰہ آباد تھا۔ اس وقت انگریزی حکومت نے اپنے کارناموں کی تشہیر و اشاعت کے لئے اور جنگ کے لئے زیادہ سے زیادہ ہندوستانی جوانوں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے 'ہماری آواز' کے نام سے اردو ہفتہ وار نکالا تھا جو کہ منسٹری آف وار کا ترجمان تھا۔ یہ غالباً ۱۹۴۲ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ آج کے عام رسالوں کے سائز کا ہوتا تھا۔ اس کا سرورق آرٹ پیپر پر ہوتا تھا اور اس پر ہندوستان کا نقشہ بنا ہوتا تھا۔ بالکل درمیان میں ساڑی میں ملبوس ایک عورت بگل بجاتی ہوئی ہوتی تھی۔ ڈزائن یہی رہتا تھا مگر رنگ بدلتا رہتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر جناب مشیر احمد علوی ناظرؔ کاکوروی تھے۔ پہلے نستعلیق کتابت ہوتی تھی پھر ٹائپ کمپوزنگ سے شائع ہونے لگا۔ اس میں دنیا کے ان تمام ممالک کی خبریں اختصار سے دی جاتی تھیں جہاں جہاں اس وقت انگریزوں کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ جاپان کے خلاف بہت کچھ چھپتا تھا۔ عموماً ایک چوہا بنایا جاتا تھا اور نعرہ ہوتا تھا 'تیرا میرا دشمن جانی یہ چوہا جاپانی' سرورق کے صفحات تصاویر سے مزین ہوتے تھے۔ اکثر آخری صفحے پر کتب و رسائل پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ ایسی نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں جن کے ذریعہ قارئین کو جنگ میں شامل ہونے کے لئے اکسایا جاتا تھا۔ یکم جنوری ۱۹۴۵ء کو اخبار میں صفحہ ۲ پر فراق گورکھپوری کی کتاب 'اندازے' پر تبصرہ ہے جو ناظرؔ کاکوروی نے کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے 'اردو زبان کو فراق پر ناز کرنا چاہئے'۔

آزادی کے بعد جب ملک میں اپنی حکومت قائم ہوئی اور اتر پردیش کا وجود عمل میں آیا۔ لکھنؤ پھر دار السلطنت بنا تب ریاستی حکومت کو اپنے کاموں سے عوام کو واقف رکھنے کے لئے کسی ذریعہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ محکمۂ اطلاعات حکومت کے کاموں سے

عوام کو خبروں کے بلیٹن سے واقف کراتا رہتا تھا۔ اردو داں عوام کی دلچسپی کی خبریں ترجمہ کرکے اردو اخباروں کو برائے اشاعت بھیجی جاتی تھیں۔ پھر ان کو باقاعدہ یکجا کرکے چھپوا کر تقسیم کیا جانے لگا۔ اس کام کے لئے کئی افسر اطلاعات تھے۔ انہیں میں اردو داں جناب علی جواد زیدی تھے۔ جناب زیدی نے از راہ ذرہ نوازی مجھے خود بتایا کہ نیوز بلیٹن کو باقاعدہ رسالہ بنانے کا خیال انہیں کی تجویز تھی۔ انہوں نے اس بلیٹن کو دلچسپ اور قابل مطالعہ بنانے کے لئے اپنے دوستوں سے ان کی نظمیں غزلیں لے کر شائع کرنا شروع کر دیں۔ یہ کاوش پسند کی گئی تو انہوں نے مضامین کا بھی سلسلہ شروع کر دیا۔ اس طرح ایک نیوز بلیٹن ایک باقاعدہ رسالہ بن گیا۔ یہ عرصہ تک 'اطلاعات' کے نام سے نکلتا رہا۔ چونکہ اس نام کے رسالے میں اطلاعات کے علاوہ کچھ گنجائش نہ تھی اس لئے ان کا نام 'اتر پردیش' رکھا گیا اور خبروں کے علاوہ کچھ اور کی گنجائش نکالی گئی۔ اس زمانے میں بعض بڑے مفید اور اہم مضامین شائع ہوتے تھے۔

جناب علی جواد زیدی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اسی اثنا میں بنگلور سے محمود ایاز کی ادارت میں نکلنے والا 'نیا دور' بند ہو گیا تو انہوں نے حکومت اتر پردیش اور خصوصاً وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنا نند کو یہ تجویز پیش کی کہ 'اطلاعات' کا نام 'نیا دور' کر دیا جائے تو اس کی اہمیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر سمپورنا نند نے یہ تجویز منظور کر لی اور تب ہی سے 'نیا دور' باقاعدہ ادبی رسالہ بن کر نکلنے لگا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر جناب علی جواد زیدی ہوئے۔ جب وہ ترقی کر کے دہلی چلے گئے تو جناب فرحت اللہ انصاری نے کچھ عرصہ تک یہ ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس کے بعد جناب صباح الدین عمر ایڈیٹر ہوئے۔ انہوں نے اس کو ایک ٹھوس ادبی رسالے کی حیثیت دی۔ ملک کے تمام ممتاز اور مقبول ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل کیا۔ اس سے یہ رسالہ بڑا اہم ادبی مجلہ بن گیا اور اس میں شائع ہونا کسی بھی ادیب یا شاعر کے لئے باعث افتخار سمجھا جانے لگا۔ صباح الدین عمر صاحب نے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے سخت اصولوں کو اپنایا اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑے بڑے ادیبوں تک کو کوئی چھوٹ نہ دی۔ انہوں نے کتابت، طباعت، معیار، مواد سب پر ہمیشہ نظر رکھی۔ جناب صباح الدین عمر صاحب کے ترقی پا جانے کے بعد جناب خورشید احمد نے 'نیا دور' کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ان کے بعد

جناب امیر احمد صدیقی ایڈیٹر ہوئے۔ ان کے سبکدوش ہونے کے بعد جناب شاہ نواز قریشی کارگزار ایڈیٹر ہوئے اور ان کے بعد جناب سید امجد حسین ایڈیٹر ہوئے پھر جناب وضاحت حسین رضوی ایڈیٹر ہوئے جنھوں نے خاص نمبر نکالنے میں شہرت حاصل کی۔ ان ہی کے زمانے میں بعض خاص نمبروں کو ہندی میں شائع کیا گیا۔ جناب وضاحت حسین رضوی سے پہلے نجیب انصاری بھی ایڈیٹر رہے مگر ان کو کم ہی وقت ملا۔

افسوس کا مقام ہے کہ 'نیادور' کے ۷۲ سال کے شمارے کہیں دستیاب نہیں ہیں اس لئے وثوق سے بتانا مشکل ہے کہ کب 'ہماری آواز' 'اطلاعات' بنا اور پھر کب 'اطلاعات' سے 'اتر پردیش' ہوا اور کس ماہ اور کن سنہ سے موجودہ 'نیادور' نکلنا شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں جناب علی جواد زیدی یقیناً رہبری کر سکتے تھے مگر افسوس اب وہ بھی نہیں ہیں۔

'نیادور' کا وصف خاص یہ ہے کہ یہ حکومت اتر پردیش کا ترجمان ہے اور محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کی نگرانی میں نکلتا ہے لیکن یہ ہمیشہ سرکاری بندشوں سے آزاد رہا ہے اور اس کو کبھی محض پروپیگنڈہ کے لئے ہی نہیں نکالا گیا بلکہ اس میں ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے ہمیشہ وہ سب کچھ ہوا جو کچھ کہ وہ ایک علمی اور ادبی رسالے سے توقع رکھتے ہیں۔ نیادور نہ صرف کتابت، طباعت اور گیٹ اپ کے لحاظ سے بہترین رسالہ ہے بلکہ اس کا معیار بھی ہمیشہ بہت بلند رہا ہے۔ اس میں ہمیشہ قابل قدر ادیبوں اور شاعروں کے رشحات قلم شریک اشاعت رہے ہیں۔ اس کے معیاری خاص نمبروں کی اشاعت کا سلسلہ اس کا وقار اور معیار بڑھا رہا ہے۔

'نیادور' کے ۷۲ سال اردو زبان و ادب کی رفتار اور افتاد کو سمجھنے میں انتہائی مدد و معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس میں شائع شدہ افسانوں کو اگر یکجا کیا جائے تو کتنے ہی شاہکار افسانے سامنے آسکتے ہیں۔ اس کے مضامین مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کر کے کتنی ہی مفید کتابیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ اس کے چھپی غزلیں اور نظمیں اردو شاعری پر عائد کتنے ہی الزامات کی تردید کرسکتی ہیں۔

'نیادور' کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کو اردو کے سبھی قابل قدر ممتاز و مقبول ادیبوں اور شاعروں کا ہمیشہ تعاون حاصل رہا ہے۔ اسی لئے اس کا معیار اور وقار برقرار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو اس طرف متوجہ ہو اور کسی ایسے طالب علم کو جو تحقیق کا حقیقی ذوق رکھتا ہو اس کو یہ کام سپرد کیا جائے کہ وہ 'نیادور' کے ۷۲ سالہ کارناموں کا جائزہ لے اور یہ بتائے کہ مجموعی طور سے 'نیادور' میں کتنے افسانے شائع ہوئے، کتنی کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے۔ شروع سے آخر تک کون کون سے ادیبوں کی تخلیقات اس میں شامل رہی ہیں۔

اردو کے قارئین کو یہ بھی بتانا چاہئے کہ جہاں اردو میں رسائل و اخبارات آنکھ جھپکتے میں دم توڑ دیتے ہیں وہاں ایسے بھی ہوتے جو ۷۲ سال زندہ رہ کر بڑا اعتماد اور وقار حاصل کرتے ہیں۔

دنیا میں ایسے رسائل اور اخبارات ایسے ہیں جن کی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ حیدرآباد سے 'مشیر دکن' نے سو سال سے زیادہ عمر پائی پھر اس کا نام بدل دیا گیا۔ قدیم رسائل میں اب کوئی نہیں باقی ہے۔ نہ نگار ہے نہ ندیم نہ زمانہ ہے اور نہ حریم۔ ہاں 'آجکل' ضرور ایک قدیم ماہنامہ ہے جو کہ آزادی سے پہلے ۱۹۴۲ء سے شائع ہوتا آرہا ہے اور اب بھی معیار برقرار رکھے ہے۔

آستانہ، مولوی، خاتون مشرق جیسے رسائل ضرور ایسے ہیں جو عرصۂ دراز سے پابندی وقت سے شائع ہو رہے ہیں ان کے اپنے مخصوص قارئین ہیں جن کی خاصی تعداد ہے۔

اطلاعات کے مطابق اتر پردیش میں فی الوقت 'نیادور' ہی ایک ایسا ماہنامہ ہے جو کہ وقار اور اعتبار برقرار رکھے ہے۔ اپنی عمر کے ۷۲ سال مکمل کر چکا ہے۔ اب نئے ایڈیٹر سہیل وحید کی ادارت میں 'نیادور' نے انقلابی تبدیلیاں کر کے کشش بڑھائی ہے تو وہ لوگ بھی اس میں دلچسپی لینے لگے ہیں جو اس کو روایتی قسم کا سرکاری رسالہ سمجھ کر پڑھنے سے گریزاں رہتے تھے۔

□□□

’نیا دور‘ کے پیشرو اخبار و جرائد آگرہ اخبار‘ ’ہماری آواز‘ ’اطلاعات‘ اور ’اتر پردیش‘ کا تاریخی جائزہ

سلمان علی خان
42/238، کٹرہ ابوتراب خاں، نخاس، لکھنؤ
موبائل: 9794114243

ہندوستان میں کلکتہ (اب کولکاتا) کو صرف قدیم فرنگی راجدھانی کا ہی شرف حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ شہر اپنی تاریخی یادگار عمارتوں، بالخصوص فورٹ ولیم کالج، وکٹوریہ میموریل، باوڑہ برج اور ضیا برج وغیرہ کے علاوہ شعر و ادب کا بیحد اہم مرکز بھی رہا ہے، جہاں دنیا کے ممتاز و معروف شاعر جناب رویندر ناتھ ٹیگور نے ۱۴ / اگست، ۱۹۱۰ء کو بنگالی نظموں پر مشتمل اپنی معرکۃ الآرا کتاب ’گیتا نجلی‘ تصنیف کر کے دنیائے ادب میں دھوم مچا دی تھی، جس پر انھیں عالمی نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ موصوف نے کولکاتا میں ہی تاریخ ساز فورٹ ولیم کالج کی ہی طرز پر ایک مثالی تعلیمی ادارہ ’شانتی نکیتن‘ قائم کر کے زبردست شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ یہی وہ شہرِ عظیم ہے، جہاں انگریزی، بنگالی، اردو، فارسی اور ہندی زبانوں کے اولین اخبارات کی اشاعت عمل میں آئی۔ سب سے پہلے مسٹر جیمس اگسٹس ہکی کی ادارت میں انگریزی کا سب سے پہلا اخبار۔ ’ہکیز بنگال گزٹ آر جنرل ایڈورٹائزر‘ کولکاتا سے ۲۹ جنوری، ۱۷۸۰ء کو اشاعت پذیر ہوا۔ اس کے بعد انڈیا گزٹ (نومبر، ۱۷۸۰ء) اور کلکتہ گزٹ (فروری، ۱۷۸۴ء) میں شائع ہوئے۔ بنگالی زبان کا پہلا ماہنامہ ’دِگ درشن‘ ڈاکٹر جوشا مارشمین نے یکم اپریل، ۱۸۱۸ء کو شائع کیا اور اس کے فوراً بعد بنگالی زبان کا پہلا ہفت روزہ اخبار ’سماچار درپن‘ ۲۳ مئی، ۱۸۱۸ء کو معرضِ وجود میں آیا، جو ۱۸۳۹ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اس کے برعکس اردو زبان کا سب سے پہلا اخبار ’جامِ جہاں نما‘ اسی شہر کولکاتا سے اردو اور فارسی کے ممتاز و معروف اور بیباک صحافی، ہری ہر دت بنگو نے منشی سدا سکھ مرزاپوری کی ادارت میں ۲۷ مارچ، ۱۸۲۲ء کو بروز بدھ شائع کیا تھا، جس کی تاریخ اجراء کے موقع پر محبانِ اردو، بالخصوص اردو صحافی ہر سال ’یومِ اردو صحافت‘ منعقد کرتے رہتے ہیں۔ اس کے چار سال بعد صوبہ شمالی و مغربی (اب اتر پردیش کے) جگل کشور کانپوری نے ۳۰ مئی، ۱۸۲۶ء کو ہندی کا پہلا اخبار ’اودنت مارتنڈ‘ شائع کرنے کے ساتھ ہی اسی نام سے کولکاتا میں ہی اپنا پرنٹنگ پریس بھی قائم کیا۔ لیکن ہندی کا یہ اولین اخبار شری پال شرما کی تحقیق کے بموجب ۴ ستمبر، ۱۸۲۷ء کو ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔

(ہفتہ وار ستارام، ۲۹ مئی، ۱۹۷۶ء، صفحہ ۲)

ہندوستان پر انگریزوں کی حکمرانی کے شروعاتی دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدراس پریسیڈنسی کے انگریز حاکم، رابرٹ کلائیو نے ۲۳ جون، ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں بنگال کے حکمراں علی وردی خاں کے جانشین، نواب سراج الدولہ کو ان کے ہی منصب داروں یار لطف خاں، میر جعفر، مانک چند، راج بلب، رائے دلاب اور جگت سیٹھ وغیرہ کی سازش کے سبب جب شکست کا سامنا کرنا پڑا تو نتیجتاً بنگال پر انگریزوں کی حکمرانی شروع ہوگئی اور تبھی انھوں نے اپنی اس فتح کو یادگار بنانے کی غرض سے کلکتہ میں ایک بڑے شاندار قلعہ کی تعمیر کی، جس کا نام انھوں نے ’فورٹ ولیم‘ رکھا، جو بعد میں ’فوجی چھاونی‘ اور ’کالج‘ کی ملی جلی شکل اختیار کرنے والا ”یہ مرکز اردو نثر کے فروغ کا مضبوط قلعہ ثابت ہوا اور ۱۸۰۰ء سے اس کالج کا بنیادی مقصد ہندوستان میں تعلیم کو فروغ دینا، انگریز

افسروں کی تربیت کرنا اور برطانوی حکومت کا استحکام قرار پایا۔"

(روزنامہ آگ لکھنؤ، ۱۲ اپریل، ۲۰۱۸ء، صفحہ ۷)

اس کے بعد انگریزوں نے بنگال کے مشہور شہر کلکتہ کو ہی اپنا دارالسلطنت بنایا۔ لیکن بعض ناگزیر اسباب کی بناء پر ۱۹۱۲ء میں انگریز حکمرانوں نے اپنا دارالسلطنت کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا، جہاں اپنی آسائش کے لئے ایک شاندار رہائش گاہ 'وائسرائے ہاؤس' کے نام سے تعمیر کرائی، جو ہندوستان کی آزادی کے فوراً بعد 'راشٹر پتی بھون' کہلانے لگا اور صدر جمہوریہ ہند کا شاندار اور قابل دید 'مسکن' بن گیا۔ اُسی زمانہ میں مجاہد آزادی اور بیباک صحافی، مولانا محمد علی جوہر نے مرکزی راجدھانی کی دہلی منتقلی کے باعث کلکتہ سے شائع ہونے والے اپنے بیحد مقبول اور موقر انگریزی اخبار 'کامریڈ' کو دہلی سے شائع کرنا شروع کر دیا، جو وائسرائے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اہلیہ لیڈی وائسرائے کا بھی بیحد پسندیدہ اخبار تھا۔ اس کے بعد" مولانا محمد علی جوہر نے دہلی کے کوچۂ چیلاں سے ۲۳ فروری، ۱۹۱۳ء کو روزنامہ 'ہمدرد' جاری کیا۔"

(تاریخ صحافتِ اردو، جلد پنجم، صفحہ ۲۹۴)

انگریز حکام نے دہلی سے ملحق تاریخی شہر آگرہ کو 'صوبۂ شمالی و مغربی' کا دارالسلطنت مقرر کیا۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ وائسرائے لارڈ کرزن نے سب سے پہلے کلکتہ میں ہی اپنی آسائش کی غرض سے 'گورنمنٹ ہاؤس' تعمیر کرنے کے بعد اس نے شملہ (ہماچل پردیش) میں 'وائسرائے لاج' بھی تعمیر کروائی، جبکہ صوبۂ شمالی و مغربی کے لفٹیننٹ گورنر سر اینٹونی میکڈونالڈ نے ۱۸۹۵ء میں موسم گرماں کی صوبائی راجدھانی نینی تال (اتراکھنڈ) میں گورنمنٹ ہاؤس تعمیر کروایا، جو آزادی کے بعد 'راج بھون' کہلایا۔

(Raj Bhawan, Nainital:A. Scotish Castle In Kumaon Highlands, By Arun Prakash, P-16)

تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۱۸ء میں شروع ہونے والی پہلی جنگِ عظیم کے دوران یوروپی ممالک، بالخصوص برطانیہ نے اپنی جارحانہ اور غاصبانہ جنگی کاروائی کے ذریعہ ترکی پر قبضہ کر کے خلافتِ اسلامیہ کا

خاتمہ کر دیا، جس کے باعث مسلمانوں میں انگریز حکمراں کے خلاف زبردست غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنے تحقیقی مقالہ 'تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ' میں رقمطراز ہیں کہ "انگریزوں سے ناراضگی کی ایسی" فضا پورے برِعظیم ہند پر مسلط ہوگئی کہ ہر قیمت پر پہلے انگریزوں کو نکالا جائے۔ چنانچہ مسلمان اور ہندو مل کر پوری قوت سے اس جدوجہد (آزادی) میں مصروف ہوگئے۔"

(صفحہ ۳۵۶)

نتیجتاً ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں عدم تعاون تحریک کا آغاز ہوا اور ۲۹/اکتوبر، ۱۹۲۰ء کو سب سے پہلے علی گڈھ یونیورسٹی کے انگریز پرنسپل کی سخت مخالفت کرتے ہوئے تمام حریت پسند طلبا نے اپنے درجات کا بائیکاٹ کر دیا، جن کی تعلیم کے لئے اُسی یونیورسٹی کی جامع مسجد میں ہی ان کی پڑھائی کا متبادل بندوبست کرنے کی غرض سے 'جامعہ ملیہ اسلامیہ' کا قیام عمل میں آیا، جس کے جلسۂ تاسیس کو خطاب کرتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے عدم تعاون تحریک کے سیاق و سباق میں طلبا کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ "مجھے لیڈروں سے زیادہ ان نونہالِ وطن کی ہمت بلند پر آفریں اور شاباش کہنا چاہئے کہ وہ موالاتِ انصاریٰ کے ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے اور اپنی عزیز زندگیوں کو ملّت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔ مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار (انگریزوں) کے اثر سے مطلقاً آزاد ہو۔۔۔۔۔ ہماری عظیم الشان متحدہ قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے (انگریزوں کی غلامی کے لئے) بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں۔"

(جامعہ کی کہانی: عبدالغفار مدھولی، ۲۰۰۳ء، صفحہ ۲۷)

مولانا ابوالکلام آزاد پوری دل جمعی کے ساتھ مہاتما گاندھی کی قیادت میں شروع کی گئی عدم تعاون تحریک میں سرگرمِ عمل ہوگئے اور کلکتہ سے الہلال، البلاغ اور پیغام جیسے انقلابی اخبارات شائع کر کے قوم کی ایسی زبردست رہنمائی کی کہ جس کی مثال مفقود ہے۔ مولانا دراصل گاندھی جی سے بہت متاثر تھے، جس کی وجہ سے وہ مسلسل جہدِ آزادی کی تحریکوں میں شامل رہے، جس کے اہم ارکان میں ان کا شمار ہونے لگا اور ایک ہردل عزیز قومی رہنما کی حیثیت سے بہت ہی جلد انھیں زبردست شہرت و مقبولیت حاصل ہوگئی، جن کی جہدِ آزادی سے تحریک حاصل کرتے ہوئے 'ہندوستانی قومیت' کے جذبہ سے سرشار ہوکر ہندو اور

مسلمان متحد ہوکر عدم تعاون تحریک میں پوری سرگرمی سے شریک ہوئے اور انگریزوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے بڑی تعداد میں گرفتاریاں دیں اور قید و

THE INDIAN PRESS

A HISTORY OF THE GROWTH OF PUBLIC OPINION IN INDIA

BY

MARGARITA BARNS

بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔اس سلسلہ میں صحافت کی ممتاز و معروف انگریز مصنف مارگریٹا بارنس نے اپنی تصنیف 'دی انڈین پریس' میں عدم تعاون تحریک میں گرفتار ہونے والے مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے ان کی جو تعداد جنوری میں ۱۴۸۰۳ بتائی تھی، وہ فروری میں بڑھکر ۱۷۸۱۸ ہوگئی۔'' (صفحہ ۳۹۵)

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت تیز رفتاری کے ساتھ بتدریج بڑھتی ہی گئی اور پورا ملک دیکھتے ہی دیکھتے 'انقلاب زندہ باد' کے نعروں سے گونج اُٹھا۔اسی زمانہ میں دہلی کی جامع مسجد کے قُرب میں واقع اردو بازار سے سردار دیوان سنگھ مفتون نے ۱۹۲۴ء میں اپنا حریت پسند اخبار ہفتہ وار 'ریاست' شائع کرنا شروع کیا، جو بقول مولانا امداد صابری ''اس اخبار کی حق گوئی نے اس کو تھوڑے عرصہ میں ہی مقبولِ عام بنا دیا۔ یہ اخبار جلد ہی اپنی آزادیٔ رائے، بے لاگ تنقید و تبصرے اور زورِ بیان کے اعتبار سے بہترین اخباروں میں شمار ہونے لگا تھا اور اخبار ریاست مظلوموں اور ستم رسیدوں کا ترجمان بن گیا تھا۔ (تاریخ صحافتِ اردو، جلد پنجم، مرتبہ مولانا امداد صابری، صفحہ ۹۳۰)

ہندوستان کے شمالی خطہ میں واقع ریاست اتر پردیش اپنی گوناگوں خصوصیات کے سبب عالم میں انتخاب رہی ہے۔لیکن جب اسے علٰحدہ ریاست کا درجہ تفویض کیا گیا تو اس کا دارالسلطنت اکبرآباد (آگرہ) کو بنایا گیا۔تبھی برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کی انگریزوں کے خلاف بڑھتی ہوئی منافرت اور دشمنی کو کم کرنے نیز ان میں اپنی ہر دلعزیزی بڑھانے کی غرض سے اردو زبان میں ایک ایسا اخبار شائع کرنے کا فیصلہ کیا، جس میں انگریز حکمرانی کی حمایت میں ایسے مضامین شائع کئے جائیں، جسے پڑھ کر ہندوستانیوں میں فرنگیوں کے خلاف نفرت میں کمی واقع ہو سکے اور اُن کے حق میں حالات سازگار ہوسکیں۔یہی ۲۴-۱۹۲۳ء کا وہ زمانہ تھا کہ انگریزوں کے قائم کردہ محکمۂ داخلہ کے اسسٹنٹ سکریٹری سے ڈاکٹر ہنڈرسن نے ملاقات کر کے 'آگرہ اخبار' شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔چنانچہ 'مسٹر ولیم کیری' کے بیان کے مطابق ''ڈاکٹر ہنڈرسن نے 'آگرہ اخبار' کے نام سے دیسی زبان کا اخبار 'فارسی رسم خط' میں جاری کیا۔''

50

YEARS OF

GOVERNORSHIP

IN

U.P.

January 3, 1971

INFORMATION DEPARTMENT

UTTAR PRADESH

(Good Old Days of Hon'ble John Company, Page 447-448)

آگرہ اخبار کے بارے میں فن صحافت کے مورخ محمد عتیق صدیقی رقمطراز ہیں کہ ''نیشنل آرکائیوز نئی دہلی، میں 'آگرہ اخبار' کے سلسلہ میں بعض سرکاری یادداشتیں اور مدیر اخبار، ڈاکٹر ہنڈرسن کے چند خطوط محفوظ ہیں، جو آگرہ اخبار کے بارے میں صحیح حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں۔اس اخبار کی اشاعت کے لئے ڈاکٹر ہنڈرسن نے اپنے آگرہ اخبار کو اور زیادہ بہتر اور جاذب نظر بنانے کی غرض سے آگرہ میں اپنا ایک پرنٹنگ پریس بھی ۱۸۳۱ء میں قائم کیا۔لیکن ان کا یہ اخبار ہندوستانیوں میں مقبولیت حاصل نہ کرسکا۔اسی لئے ہنڈرسن نے مایوس ہوکر نومبر، ۱۸۳۲ء میں اردو زبان کے 'آگرہ اخبار' کو انگریزی کا اخبار بنادیا۔''

مقام	مطبع	اخبارات					مطبوعات	
		اخبار	اڈیٹر	اشاعت	[illegible]	[illegible]	مجموعی تعداد	مجموعی اشاعت
آگرہ	زبدۃ الاخبار	زبدۃ الاخبار	منشی واجد علی خاں	۵۳	۰	۶۳۹	۰	۰
آگرہ	نور الابصار	نور الابصار	منشی سدا سکھ لال	۲۲۳	۰	۱۳۲۲	۳	۶۵۰۰
آگرہ	نور الابصار	بدھی پرکاش	منشی سدا سکھ لال	۲۱۶	۰	۱۲۹۰	۰	۰
آگرہ	اکبری	مطلع الاخبار	شیخ خادم علی	۳۶	۰	۲۳۲	۲	۰
آگرہ	قادری	قطب الاخبار	[illegible]	۳۳	۰	۲۹۶	۰	۰
آگرہ	اسعد الاخبار	اسعد الاخبار	منشی [illegible]	۴۳	۰	۲۹۳	۱۲	۲۰۳۲۵
آگرہ	اسعد الاخبار	[illegible]	منشی [illegible]	۰	۰	[illegible]	۰	۰
آگرہ	جام جمشید	۰	[illegible]	[illegible]	۰	۰	۰	۰
آگرہ	آگرہ کالج	[illegible]	[illegible]	۵۵	۰	۹۲۰	۵	۲۳۱۱
آگرہ	[illegible]	[illegible]	حکیم [illegible]	۳۰	۰	۳۰۰	۹	۱۱۹۰

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۰۴۹
[illegible]	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۰۵۰
				۱۰۵۱
[illegible]	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۰۵۲
[illegible]	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۰۵۳
۰	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۰۵۴
۰	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۱۰۵۵

محمد عتیق صدیقی

[illegible]

(صوبۂ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات، مرتبہ محمد عتیق صدیقی، صفحہ-۵۳)

محمد عتیق صدیقی کی متذکرہ تصنیف دراصل ایک سرکاری رپورٹ کی چوتھی جلد کے مندرجات پر مبنی ہے، جس میں ''دیسی مطابع کے زیر عنوان ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۳ء تک کی وہ رپورٹیں بھی شامل کی گئیں ہیں، جن کا اسی صوبہ کے اخبارات ومطابع سے براہ راست تعلق تھا۔ اس باب کے آخر میں ۱۸۵۸ء کی رپورٹ بھی شامل کردی گئی تھی، جو مختصر اور اجمالی ہونے کے باوجود بیحد اہم ہے۔ یہ چھ برسوں کی سرگزشت (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۳ء) جو ۱۲۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مولف ان رپورٹوں کے وجود سے بے خبر تھا۔ اسی دوران ایک نوجوان ''ہم تحقیق'' دوست شری بچ دیو کو یہ رپورٹیں ملیں، جو ''انیسویں صدی کے نصف اول کی دلی اور اس کے قرب و جوار کی سماجی واقتصادی زندگی'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقی کام کررہے تھے۔ انھوں نے ازراہِ علم دوستی، یہ رپورٹیں مجھے دکھلائیں۔ اس عنایت کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں۔'' (ایضاً، صفحہ ۷و۱۲)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ صوبۂ متحدہ ومغربی (اب اتر پردیش) کے محکمۂ داخلہ کے، جن انگریزی داں اور انگریز پرست اسسٹنٹ سکریٹریوں نے انتہائی دلچسپی اور دیدہ ریزی کے ساتھ یہ رپورٹ مرتب کی تھی، ان کے نام اور عہدہ کی تفصیل محمد عتیق صدیقی کے بموجب یہ ہے:

کاش! صحافت کے ان محققین نے اخبار و مطابع کی چوتھی جلد سے پہلے شائع ہونے والی تیسری، دوسری اور جلد اول کے بارے میں بھی ضروری تحقیق کر کے درکار معلومات فراہم کر دی ہوتیں تو 'آگرہ اخبار' جیسے متعدد گمنام اخبارات کی مکمل تفصیل اور متعلقہ معلومات یقیناً معرض وجود میں آجاتیں۔ اسی فروگزاشت کے سبب یہ پتہ لگا پانا دشوار ہوگیا ہے کہ آگرہ اخبار اردو زبان میں دوبارہ کب شائع ہوا اور اس کی اشاعت کب تک جاری رہی۔ کیونکہ ۱۹۳۴ء میں انگریز حکام نے سرکاری زبان، 'فارسی' کو جب کالعدم قرار دے کر فارسی رسم الخط کی مقبول عام زبان 'اردو' کو عدالتی اور 'سرکاری زبان' کا درجہ تفویض کر دیا تھا تو یہ مکمل وثوق کے ساتھ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اُس وقت جبکہ 'اردو زبان' سرکاری زبان بن چکی تھی تو آگرہ اخبار یقیناً اردو زبان میں دوبارہ شائع ہونے لگا ہوگا۔ البتہ آگرہ اخبار کے علاوہ اسی زمانہ میں اردو کے متعدد اخبار شائع ہوئے، جن کی تفصیل محمد عتیق صدیقی کی تصنیف 'صوبۂ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات' میں شائع شدہ آگرہ کے اخبارات کی تفصیل منسلکہ ذیل گوشوارہ کے بموجب ملاحظہ فرمائیں۔

شمالی ہند کا یہ اہم خطہ، جسے اب اتر پردیش کہا جاتا ہے، ۱۸۳۴ء تک بنگال پریسیڈنسی میں شامل رہا ہے۔ ریاست کے نظم ونسق کو بہتر بنانے کی غرض سے اس صوبہ کے دارالسلطنت کو 'آگرہ' سے 'الہ آباد' منتقل کر دیا گیا۔ اتر پردیش کے ۹ویں گورنر ڈاکٹر بیجواڑہ گوپال ریڈی (مدت کار: یکم مئی، ۱۹۶۷ء تا ۳۰ جون، ۱۹۷۲ء) نے ۳ جنوری، ۱۹۷۱ء کو اتر پردیش میں گورنر شپ کے ۵۰ سالہ جشن کے انعقاد کے موقع پر منعقدہ ایک تقریب کو خطاب کرتے ہوئے اتر پردیش کی تشکیل سے متعلق اہم تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا تھا کہ ''اتر پردیش ۱۹۳۴ء تک بنگال پریسیڈنسی میں شامل رہا تھا، جسے تبھی اس سے علٰحدہ کیا گیا اور اسے ۱۹۳۶ء میں 'صوبۂ شمالی ومغربی' کے نام سے موسوم کیا گیا، جس کی سربراہی کے لئے ایک لفٹیننٹ گورنر کی تقرری بھی کی گئی اور ۱۹۰۲ء میں اس صوبہ کا نام پہلے 'صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ' رکھا گیا۔ اس کے بعد اس ریاست کا نام 'صوبۂ متحدہ' رکھ دیا گیا اور لکھنؤ میں واقع سردھنا (مظفر نگر) کی مشہور بیگم سمرو کی قیام گاہ، 'کوٹھی حیات بخش' کو 'گورنمنٹ ہاؤس' بنایا گیا، جو ہندوستان کی آزادی کے بعد 'راج بھون' کہلایا۔ ہندوستان میں میں ۲۶ جنوری، ۱۹۵۰ء کو اس صوبۂ متحدہ کا نام بالآخر 'اتر پردیش' رکھ دیا گیا۔

یاد رہے کہ صوبۂ متحدہ (United Provinses) کے دارالسلطنت کو آگرہ سے جب ۱۹۰۲ء میں الہ آباد منتقل کیا گیا تو دوسری جنگِ عظیم

(۱۹۳۹ء) کے دوران الہ آباد کلکٹریٹ میں قائم شدہ 'وار آفس' کے زیرِ اہتمام محکمۂ داخلہ کے اسسٹنٹ سکریٹری، جناب مشیر احمد علوی 'ناظر کاکوروی' کی ادارت میں ۱۳ جولائی، ۱۹۴۳ء، کو الہ آباد سے اس سے قبل شائع ہونے والے اردو اخبار 'آگرہ اخبار' کی ہی طرز پر ایک ہفتہ وار مصور اخبار 'ہماری آواز' کی اشاعت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس اخبار کے بارے میں ماہنامہ 'نیا دور' کے تمام مدیران، جس میں نیا دور کے بانی مدیر، مرحوم جناب علی جواد زیدی صاحب کیسے ناواقف رہ گئے کہ اپنی سرگزشتِ حیات میں 'ہماری آواز' کا ذکر تک نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں میری فکر میرے رفیقِ خاص اور ممتاز و بیباک صحافی، جناب احمد ابراہیم علوی کی اس فکر سے ملتی ہے کہ یہ بات ''وثوق سے بتانا مشکل ہے کہ نیا دور سے پہلے کب 'ہماری آواز'، 'اطلاعات' بنا اور پھر کب 'اطلاعات' سے 'اتر پردیش' ہوا اور کس ماہ اور کس سنہ سے موجودہ 'نیا دور' نکلنا شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں جناب علی جواد زیدی یقینا رہبری کر سکتے ہیں اور انھیں کرنا بھی چاہئے۔ کیوں کہ یہ مفید معلومات ہوں گی۔

(نیا دور، نصف صدی نمبر، ص ۱۰۲)

ہندوستان میں جب ۱۹۳۹ء، میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو ہندوستانیوں میں فوج میں بھرتی ہونے کا جذبہ استوار کرنے کی غرض سے 'آگرہ اخبار' کی ہی طرز پر الہ آباد کلکٹریٹ میں قائم شدہ 'وار آفس' میں تعینات اسسٹنٹ سکریٹری، جناب مشیر احمد علوی 'ناظر کاکوروی' کی ادارت میں ۱۳ جولائی، ۱۹۴۳ء کو ہفتہ وار مصور سرکاری اخبار 'ہماری آواز' جاری کیا گیا تھا، جس کے چیف ایڈیٹر الہ آباد کے ڈپٹی کلکٹر، مسٹر کھڑک سنگھ تھے۔ ہماری آواز کا سالانہ چندہ اُس وقت تین روپے اور ششماہی چندہ ڈیڑھ روپے تھا۔ اس اخبار کی جلد ۲، شمارہ نمبر ۳۲، مورخہ سنیچر، ۱۲ فروری، ۱۹۴۴ء سے جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۱۵ و ۱۶ تک کے شمارے جناب ابراہیم علوی کے توسط سے راقم الحروف کے پاس محفوظ ہیں۔ اس مصور ہفت روزہ 'ہماری آواز' کے سرورق کے بعد پہلے صفحہ پر اخبار کا نام، جلد نمبر و شمارہ نمبر اور تاریخ کے علاوہ مدیرِ اخبار، جناب مشیر احمد علوی 'ناظر کاکوروی' کا اداریہ 'اڈیٹر کی میز' کے دائیں جانب ایک تصویر مندرج رہتی تھی، جس کی تفصیل منسلک ہے۔

جلد ۳ | ۱۵ دسمبر ۱۹۴۴ء | نمبر ۹-۱۰

اڈیٹر کی میز

جلد ۳ | ہماری آواز — یکم اگست ۱۹۴۴ء | نمبر ۲

اس مصور اخبار 'ہماری آواز' کی افادیت و اہمیت صرف یہ تھی کہ اس میں ۱۹۳۹ء، کی دوسری جنگِ عظیم سے متعلق خبروں اور اداریوں کی اشاعت کو اولیت حاصل تھی۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ 'ہماری آواز' کی یہ بھی ایک بڑی خصوصیت تھی کہ اس کے ایڈیٹر، مشیر احمد علوی، ناظر کاکوروی نہ صرف خود شاعر اور ادیب تھے، بلکہ وہ اپنے

اس مصور اخبار میں مقامی اور غیر مقامی ادبا و شعراء کی تخلیقات کی اشاعت کو مسلسل ترجیح دیتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر الہ آباد کلکٹری کچہری میں زیادہ اناج پیدا کرنے کی اسکیم کی عمل آوری سے متعلق تصویر کے نیچے 'سپاہی کے گیت' عنوان سے مسٹر زدوش پریمی کی ایک نظم کے علاوہ ایک فوجی کی تصویر کے نیچے لکھنؤ کے مشہور و مقبول شاعر و ادیب، شوکت تھانوی کی ایک نظم بھی شائع ہوئی تھی، جس میں 'جا رہا ہے ایک سپاہی جنگ کے میدان میں' عنوان سے شائع ہوئی تھی جو منسلک ہے۔

'ہماری آواز' کے مدیر، جناب مشیر احمد علوی نے اپنے اداریہ 'اڈیٹر کی میز' کے تحت دوسری جنگِ عظیم کی سرگرمیوں، فوجی حکمت عملی اور فوجی کامیابی و کامرانی کا ذکر کرتے ہوئے ایک انتہائی دلچسپ کیپشن بھی مندرج کیا تھا، جس میں ایک چوہے کے کارٹون کے سامنے یہ پرکشش جملہ لکھا گیا تھا:

''تیرا میرا دشمن جاپانی، یہ چوہا جاپانی''

ہماری آواز' کے ایڈیٹر، جناب مشیر احمد علوی 'ناظر کاکوروی' نے دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی اور جاپان پر مسٹر چرچل کی کامیابی پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے درج ذیل اداریہ سپرد قلم کیا تھا:-

'ہماری آواز' کے ایڈیٹر، جناب مشیر احمد ناظر کاکوروی صرف جنگ ۱۹۳۹ء کے بارے میں خبریں اور مضامین ہی شائع نہیں کرتے تھے، بلکہ برائے تبصرہ موصول ہونے والی ادبی کتب اور شعری مجموعوں پر بھی باقاعدہ تبصرہ کر کے اپنے مصور اخبار 'ہماری آواز' میں برابر شائع کرتے رہتے تھے۔ مشہور و مقبول شاعر فراق گورکھپوری کی کتاب پر ہماری آواز کے یکم جنوری و ۱۵ جنوری، ۱۹۴۵ء میں شائع شدہ ناظر کاکوروی کا تبصرہ بیحد اہمیت کا حامل ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب صوبۂ متحدہ میں ۳ جنوری، ۱۹۲۱ء کو سر اسپینسر ہارکورٹ بٹلر کو ترقی دیکر گورنر بنایا گیا تھا، تو ان کے بعد ۹ گورنر مقرر ہوئے۔

ان گورنروں میں انگریزوں کے علاوہ صرف ایک ہندوستانی گورنر مقرر ہوئے، جن کا نام تھا، محمد احمد سعید خاں چھتاری۔ موصوف نے راج بھون کے پورٹیکو کے سامنے لان کے سب سے آخر میں ایک بہت ہی خوبصورت بارہ دری بنوائی تھی۔ مسٹر بٹلر نے ہی ۱۹۲۲ء میں صوبۂ متحدہ کی راجدھانی الہ آباد سے لکھنؤ منتقل کر دی تھی اور سکریٹیریٹ کے محکمۂ داخلہ سے ملحق ایک نیا 'شعبۂ اطلاعات' قائم کیا گیا تھا، جس میں سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں مرحوم جناب صباح الدین عمر صاحب کی تقرری باضابطہ عمل میں آئی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کے چھوٹے بھائی اور ممتاز و معروف صحافی،

تیرا میرا دشمن جاپانی
یہ چوہا جاپانی

مرحوم جناب صلاح الدین عثمان صاحب نیا دور کے نصف صدی نمبر میں رقمطراز ہیں: ''صباح الدین عمر صاحب کے بغیر رسالہ 'نیا دور' کا ذکر نا تمام رہتا ہے۔۔۔۔ ۱۹۳۷ء میں وہ پبلک سروس کمیشن کے ایک مقابلہ کے امتحان میں بیٹھے۔ یہ امتحان تھا محکمۂ اطلاعات کے لئے 'صحافی' کے عہدہ کا۔ امتحان میں کامیاب ہونے پر وہ انگریزی زبان میں شائع ہونے والی کتب و رسائل کے ذمہ دار (Incharge-English Publications) بنائے گئے۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اُن کو اردو زبان میں اشاعت کا بہت سا کام سونپ دیا گیا۔ چنانچہ اس کام کے لئے ایک الگ 'ڈائرکٹریٹ آف انفارمیشن' قائم ہوا۔ اس نظامت کے قائم ہونے کے بعد صباح الدین صاحب کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں پبلیسٹی کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ اس پر مزید یہ کہ اُن کو انگریزی کے ماہوار رسالہ اتر پردیش کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا حکم دیا گیا اور انھوں نے یہ سب ذمہ داریاں بخوشی قبول کر لیں۔ (صفحہ ۱۰۷)

صباح الدین عمر صاحب کی ہی ادارت میں 'اطلاعات صوبۂ متحدہ' نام سے ایک نیا جریدہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ محترم جناب صباح الدین عمر کے بعد جناب مولوی فرحت اللہ انصاری فرنگی محلی اور جناب ندیم الرحمٰن قدوئی کی تقرری بھی نظامت اطلاعات میں باقاعدہ عمل میں آئی۔ مرحوم قدوئی صاحب، حضرت گنج لکھنؤ میں واقع اسٹیٹ انفارمیشن سنٹر تیز لائبریری کے بانی انچارج تھے، جسے انھوں نے ذاتی دلچسپی لے کر زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب اور پرکشش بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ ان سب افسران کے بعد محترم جناب علی جواد زیدی صاحب کی تقرری بھی نظامت اطلاعات میں عمل میں آئی۔ جناب مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی کی ادارت میں ہفت روزہ 'ہماری آواز' کی اشاعت کے بعد صباح الدین عمر صاحب کی ہی ادارت میں محکمۂ داخلہ کے شعبۂ اطلاعات کے زیرِ اہتمام 'اطلاعات صوبۂ متحدہ' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار یکم جنوری، ۱۹۴۶ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں محترم جناب علی زیدی صاحب رقمطراز ہیں کہ ''رفتہ رفتہ اطلاعات کے ''آزادی نمبر'' اور 'گاندھی نمبر'' نکلنے لگے۔ (دو ماہی اکادمی، لکھنؤ، صباح الدین عمر نمبر، صفحہ ۲۰)

ممتاز محقق جناب عرفان عباسی صاحب بھی اطلاعات کے ان دونوں خصوصی شماروں کے بارے میں رقمطراز ہیں 'اس کے دو خاص نمبر یعنی ۱۵ اگست کو 'یوم آزادی نمبر' اور 'اکتوبر میں' گاندھی جینتی نمبر' نکلتے

تھے۔ اس وقت ۱۹۴۹ء کے یہ دونوں نمبر میرے سامنے ہیں۔ ۱۵ اگست کی ضخامت ۱۳۶ صفحات ہے، قیمت آٹھ آنہ درج ہے اور گاندھی جینتی نمبر کی ضخامت ۸۸ صفحات ہے اور آٹھ آنہ قیمت درج ہے۔ ان دونوں نمبروں میں جن اہم ادبی شخصیات کی تخلیقات شائع ہوئی تھیں، ان میں فراق گورکھپوری، پروفیسر محمد مجیب، حیات اللہ انصاری، سراج لکھنوی، علی عباس حسینی، شمیم کرہانی، عبادت بریلوی وامق جونپوری، اعظم حسین اعظم، پروفیسر محمد سلطان، اسلم لکھنوی، غلام احمد فرقت، اُپیندر ناتھ اشک، نیاز فتح پوری، پروفیسر محمد عقیل، ساغر نظامی، صالحہ عابد حسین، اثر لکھنوی، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، کشن پرشاد کول، انتصار نیوتنوی، آنند نرائن ملا اور ڈاکٹر سید محمود وغیرہ شامل ہیں۔'' (صفحہ ۸۹)

اس طرح یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ماہنامہ 'اطلاعات' دراصل ایک معیاری ادبی جریدہ تھا۔ اس کے باوجود اطلاعات کا نام زیدی صاحب کو برابر کھٹکتا رہا اور اس کا نام تبدیل کر کے اسے 'نیا دور' بنانے پر مسلسل کوشاں رہے۔ اس ضمن میں محترم جناب علی زیدی صاحب اپنی سرگزشتِ حیات 'یادوں کی رہگزر' سے متعلق 'کشمکشِ حیات' کے تحت رقمطراز ہیں:

''ہمارے زیادہ تر اصحاب وکالت، اخبارنویسی یا تعلیمی شعبوں کی طرف مائل ہو گئے۔ خود میں نے بھی اعظم گڑھ میں وکالت کی ابتدا کی۔۔۔۔ محترم سید بشیر حسین زیدی کے اصرار پر میں نے اعظم گڑھ کے بجائے غازی پور میں باقاعدہ وکالت کا آغاز کیا۔۔۔۔ تین چار سال مشکل سے گزرے ہوں گے کہ لکھنؤ کی یاد ستانے لگی۔ اسی دوران کیشو دیو مالویہ واردِ غازی پور ہوئے۔ اُن کا تعلق پنڈت مدن موہن مالویہ کے خانوادہ سے تھا اور وہ اتر پردیش حکومت میں پارلی منٹری سکریٹری تھے۔ ملاقات ہونے پر مجھ سے کہنے لگے کہ ''اماں زیدی! ہندوستان گیر سیاست میں حصہ لینے کے بعد اس چھوٹے سے شہر غازی پور میں تمہارا دل کیسے لگتا ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''شادی کے بعد میرے سر بڑی ذمہ داریاں آپڑی ہیں۔ کیشو دیو جی مسکرائے اور شدید اصرار کیا کہ تمہیں لکھنؤ جیسے مرکزی شہر کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔ تمہارے جیسے ذہین نوجوان کے لئے، جس کے پس پشت بہت سے ادبی اور سیاسی کارنامے ہیں، لکھنؤ آنا مشکل نہ ہوگا۔'' اس طرح زیدی صاحب کو 'اپنے پرانے لکھنؤ میں نئی زندگی شروع کرنے کا موقع ملا۔

زیدی صاحب لکھنؤ میں اپنی سرکاری ملازمت کے بارے میں خود رقمطراز ہیں کہ ''میں حکومتِ اتر پردیش کے محکمۂ اطلاعات میں ۱۹ جولائی ۱۹۴۶ء کو افسر

انچارج، شعبۂ اردو' کی حیثیت سے وارد ہوا۔ میرے آنے کے پہلے اردو، ہندی اور انگریزی کے شعبے الگ نہیں تھے۔ میرے ہی ساتھ ہندی شعبہ کے انچارج دویا بھاسکر جی تھے، (جو بعد میں ہندی روزنامہ '' آج'' کے ایڈیٹر ہوئے۔) اور شری پی پی سنگھ شعبۂ انگریزی کے انچارج تھے، (جو پہلے پنجاب یونیورسٹی میں صدر، شعبۂ صحافت رہ چکے تھے۔) ڈاکٹر محمود الظفر (نام ٹھیک سے یاد نہیں) ۱۹۳۷ء میں اردو کے ڈپٹی ڈائرکٹر ضرور مقرر ہوئے تھے۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں جنگِ (عظیم) کے سوال پر پہلی کانگریسی وزارت مستعفی ہوئی تو وزراء کے ساتھ ہی ڈاکٹر (محمود الظفر) صاحب نے بھی استعفیٰ دے دیا۔

ڈائرکٹر (اطلاعات) مسٹر اُگرا تھے، جن کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم گھرانہ سے تھا۔ وہ اردو سے خاص شغف رکھتے تھے۔ سکریٹری (اطلاعات) سر تیج بہادر سپرو کے فرزند ارجمند، آنند نارائن سپرو، آئی سی ایس تھے۔ اس خوشگوار فضا میں محکمۂ (اطلاعات) کی تنظیم نو کے منصوبے بنے۔ وزیر اطلاعات سمپورنانند جی تھے، جو ہندی پرستی کے علاوہ اردو میں شعر بھی کہتے تھے اور آنند تخلص کرتے تھے۔ اُن کے پارلی منٹری سکریٹری، کیشو دیو مالویہ، پنڈت مدن موہن مالویہ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ میں پہلے سے ہی شعبۂ اردو کے اہم کارکنوں سے واقف تھا اور وہ بھی مجھے جانتے تھے۔ ان میں فرحت اللہ انصاری فرنگی محلی، اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نمایاں اراکین میں رہ چکے تھے، اس واسطے سے اُن سے تعلقات نسبتاً زیادہ ہی تھے۔ وہ اچھے حافظ اور اچھے مقرر بھی تھے۔ صباح الدین عمر صاحب سے سیاسی قربت تو نہ تھی۔ لیکن ایک اور قربت اُن کے وطن نگرام کی بدولت پیدا ہوئی۔ شعبہ کے ایک اور رکن ندیم الرحمٰن قدوائی، شہر لکھنؤ کے مشہور مسلم لیگی، احسان الرحمٰن قدوائی کے صاحبزادے تھے۔ لیکن والد کی زندگی ہی میں علی الاعلان قوم پروروں میں شامل ہو گئے تھے اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے فعال رکن بھی رہ چکے تھے۔ خانہ پُری کے لئے ایک اردو ماہنامہ 'مرکزی اطلاعات' کی طرز پر یہاں سے نکلتا تھا۔ اُس کا نام اطلاعات تھا۔ یہ ماہنامہ کیا تھا؟ پریس نوٹوں کا ایک پلندا تھا، جسے کسی ایڈیٹنگ کے بغیر شائع کر دیا جاتا تھا۔ ابتدائی صوری اور جزوی تزئینی تبدیلیوں کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ ادبی عنصر کا بھی اضافہ کرنا چاہئے۔ میں نے اپنے چند دوستوں، شمیم کرہانی، فرقت کاکوروی اور امین سلونوی وغیرہ سے یہ دوستانہ فرمائش کی کہ وہ اپنے مضامین و نظمیں بطور عطیہ چھپنے کے لئے دیں۔ رسالہ کا 'اطلاعات' نام برابر کھٹکتا رہتا تھا۔ ایک نام 'نیادور' بھی

ذہن میں آیا۔ نام تبدیل کرنے کی تجویز میں نے ڈائرکٹر کی وساطت سے وزیرِ اطلاعات، ڈاکٹر سمپورنانند کو بھیجی۔ انھوں نے نام پسند کیا اور میرے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے ذرا تامل کے بعد فائل پر لکھ دیا کہ ''اطلاعات'' کے مقابلہ میں 'نیا دور' بہتر رہے گا۔ اس طرح اس ادبی رسالہ کا نیا دور شروع ہوا اور آج یہ جریدہ اردو کے اہم ترین ماہناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مئی ۱۹۵۷ء کے آغاز میں حکومتِ ہند کے 'پریس انفارمیشن بیورو' میں منتقل ہو گیا اور ریاستی حکومت سے تعلقات باقی نہ رہے۔''

(نیا دور لکھنؤ، فروری، ۲۰۰۱ء، صفحہ ۷ تا ۹)

'نیا دور' کے آغاز سے متعلق یہ امر کہ اس جریدہ کا اجراء کس تاریخ اور کس سنہ میں ہوا تھا؟ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ البتہ نامور محقق، عرفان عباسی صاحب نے 'نیا دور' کے نصف صدی نمبر میں اپنے گرانقدر مقالہ 'نیا دور کے پچاس سال: سرسری جائزہ' میں رقمطراز ہیں:

''اس وقت نیا دور کا جون، ۱۹۵۶ء کا شمارہ پیش نظر ہے، جس کے سرورق جلد ۱۱ نمبر ۶ درج ہے۔ اس اندراج کے مطابق نیا دور کا سال (اشاعت) یقینی طور پر ۱۹۴۶ء قرار پاتا ہے۔ اسی زمانہ میں صوبائی حکومت کا ایک ۱۵ روزہ ادبی رسالہ پبلی کیشن بیورو، محکمۂ اطلاعات کی نگرانی میں ہر ماہ کی پہلی اور ۱۵ تاریخ کو ''اطلاعات صوبہ متحدہ'' کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ اطلاعات، جنوری ۱۹۴۹ء کے پہلے شمارہ، پر جلد ۴ اور نمبر ۱ درج ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جریدہ کا اجراء بھی ۱۹۴۶ء میں ہی ہوا تھا۔''

(نیا دور مارچ تا مئی، ۱۹۹۵ء، صفحہ ۸۹-۸۸)

اس متذکرہ اقتباس کو دوبارہ غور سے پڑھا جائے تو یہ دونوں رسالے یعنی 'اطلاعات صوبہ متحدہ' کا برسوں بعد نام تبدیل کر کے اُسے 'نیا دور' بنایا گیا تو جلد نمبر اور شمارہ نمبر تبدیل نہیں کیا گیا یعنی 'اطلاعات صوبہ متحدہ' اور 'نیا دور' کی تاریخ اور سنہ اجراء حتمی طور پر یکساں ہی برقرار رہ گئیں۔ تاہم **'اطلاعات صوبہ متحدہ'** کا پہلا شمارہ یقیناً یکم جنوری، ۱۹۴۶ء کو شائع ہوا تھا، جس پر جلد نمبر ۴ اور شمارہ نمبر ۱ مندرج، تھا جس کی تاریخ اجراء، یکم جنوری، ۱۹۴۶ء منسلکہ گوشوارہ کے بموجب بالکل صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔

भारत के समाचार पत्र 1985

भाग-II

भारत के समाचार पत्रों के पंजीयक का उनतीसवां प्रतिवेदन

उत्तर प्रदेश उर्दू मासिक 1289

2716. नया दौर (1951) : (1) और (7) प्रकाशन ब्यूरो. सूचना निदेशालय, उत्तर प्रदेश, लखनऊ. (2) शिरोमणि शर्मा. (3) अशोक दर, (4) खुरशीद अहमद, (5) 50 पैसे. (6) न्यू गवर्नमेंट प्रेस. (8) आंकड़े नहीं दिये. (9) साहित्यिक और सांस्कृतिक ।

جلد نمبر	شمارہ نمبر	تاریخ اجراء
۱	۱	یکم جنوری، ۱۹۴۶ء
۱	۲	فروری، ۱۹۴۶ء
۱	۳	مارچ، ۱۹۴۶ء
۱	۴	اپریل، ۱۹۴۶ء
۱	۵	مئی، ۱۹۴۶ء
۱	۶	جون، ۱۹۴۶ء
۱	۷	جولائی، ۱۹۴۶ء
۱	۸	اگست، ۱۹۴۶ء
۱	۹	ستمبر، ۱۹۴۶ء
۱	۱۰	اکتوبر، ۱۹۴۶ء
۱	۱۱	نومبر، ۱۹۴۶ء
۱	۱۲	دسمبر، ۱۹۴۶ء
۲	۲-۱	یکم جنوری، ۱۹۴۷ء
۲	۴-۳	فروری، ۱۹۴۷ء
۲	۶-۵	مارچ، ۱۹۴۷ء
۲	۸-۷	اپریل، ۱۹۴۶ء
۲	۱۰-۹	مئی، ۱۹۴۷ء
۲	۱۲-۱۱	جون، ۱۹۴۷ء
۲	۱۴-۱۳	جولائی، ۱۹۴۷ء
۲	۱۶-۱۵	اگست، ۱۹۴۷ء
۲	۱۸-۱۷	ستمبر، ۱۹۴۷ء
۲	۲۰-۱۹	اکتوبر، ۱۹۴۷ء
۲	۲۲-۲۱	نومبر، ۱۹۴۷ء
۲	۲۴-۲۳	دسمبر، ۱۹۴۷ء
۳	۲-۱	یکم جنوری، ۱۹۴۸ء
۳	۴-۳	فروری، ۱۹۴۸ء
۳	۶-۵	مارچ، ۱۹۴۸ء
۳	۸-۷	اپریل، ۱۹۴۸ء
۳	۱۰-۹	مئی، ۱۹۴۸ء
۳	۱۲-۱۱	جون، ۱۹۴۸ء
۳	۱۴-۱۳	جولائی، ۱۹۴۸ء
۳	۱۶-۱۵	اگست، ۱۹۴۸ء
۳	۱۸-۱۷	ستمبر، ۱۹۴۸ء
۳	۲۰-۱۹	اکتوبر، ۱۹۴۸ء
۳	۲۲-۲۱	نومبر، ۱۹۴۸ء
۳	۲۴-۲۳	دسمبر، ۱۹۴۸ء
۴	۱	یکم جنوری، ۱۹۴۹ء

محترم جناب علی جواد زیدی کی کوششوں سے اطلاعات صوبہ متحدہ کا نام بالآخر تبدیل کر کے یہ جریدہ کس تاریخ اور کس سنہ میں 'نیا دور' بنا، یہ ہنوز پردۂ خفا میں ہے۔ البتہ سب سے پہلے جناب ڈاکٹر محمد اظہر مسعود خاں رقمطراز ہیں کہ ''اطلاعات' کے نام کی تبدیلی کے بعد اپریل، ۱۹۵۵ء کا شمارہ 'نیا دور' کے نام سے شائع ہوا اور

تب سے آج تک اُسی نام سے شائع ہو رہا ہے۔ بالفاظ دیگر، 'نیا دور' کا پہلا شمارہ زیدی صاحب کی ادارت میں ہی اپریل، ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔''

(نیا دور، نومبر، دسمبر، ۲۰۰۵ء، علی جواد زیدی نمبر، صفحہ ۲۶)

ماہنامہ 'نیا دور' کی اشاعت کا آغاز اپریل، ۱۹۵۵ء سے ہوا تھا، یہ غلط اس وجہ سے بھی ہے کہ ہندوستان کے اخبارات سے متعلق حکومتِ ہند کے رجسٹرار کی شائع کردہ درج ذیل رپورٹ میں 'نیا دور' کا سنہ اشاعت ۱۹۵۱ء مندرج ہے۔ اس کے علاوہ علی جواد زیدی صاحب کی ہی ادارت میں 'نیا دور' کا آزادیٔ نمبر اگست، ۱۹۵۶ء میں جب شائع ہوا تو اس پر جلد نمبر ۲ کے بجائے جلد نمبر ۱۱ اور شمارہ نمبر ۸ مندرج ہے۔ اس بنیاد پر نیا دور کا اپریل، ۱۹۵۵ء کی اولین اشاعت خود بہ خود مشتبہ اور غلط ثابت ہو جاتی ہے۔

محترم جناب علی جواد زیدی صاحب کے اتر پردیش محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، لکھنؤ سے جنوری ۱۹۵۷ء کو اپنی ملازمت سے مرکزی حکومت میں منتقلی کے بعد نیا دور کے ایڈیٹر جناب مولوی فرحت اللہ انصاری مقرر ہوئے اور اس کے اگلے ہی ماہ فروری ۱۹۵۷ء میں موصوف نے ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ کا جو شمارہ شائع کیا، وہ 'جمہوریت نمبر' تھا، جس پر جلد نمبر ۱۲ اور شمارہ نمبر ۲ مندرج ہے۔ جناب فرحت صاحب نے اپنے اداریہ 'عرضِ حال' کے تحت رقمطراز ہیں:

''زیدی صاحب (علی جواد زیدی، جو جنوری، ۱۹۵۷ء تک ایڈیٹر تھے) نیا دور کے اُس وقت بھی ایڈیٹر تھے، جب اُن کا نام زینت دہ نیا دور نہ تھا، وہ اُس وقت بھی نیا دور کے سرپرست تھے، جب فائلوں کے انبار میں دبے رہتے تھے۔۔۔۔ نیا دور جو کچھ بھی ہے، وہ اُنھیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔''

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ متذکرہ ماہنامہ 'اطلاعات' صوبۂ متحدہ کے گوشوارہ کے ساتھ 'نیا دور' کے جلد نمبر ۱۲، شمارہ ۲ سے پچھلے مہینوں میں شائع ہونے والی جلدوں اور شماروں کا شمار کیا جائے تو یہ سلسلہ ۱۵ روزہ اطلاعات صوبۂ متحدہ کی جلد اول کے شمارہ نمبر ۱ تک پہنچتا ہے، جو درج ذیل گوشوارہ سے بالکل صحیح ثابت ہو جاتا ہے:

۱۵/اگست، ۱۹۴۸ء جلد ۳ نمبر ۸
۱۵/اگست، ۱۹۵۳ء جلد ۸ نمبر ۸
۱۵/اگست، ۱۹۴۹ء جلد ۴ نمبر ۸
۱۵/اگست، ۱۹۵۴ء جلد ۹ نمبر ۸
۱۵/اگست، ۱۹۵۰ء جلد ۵ نمبر ۸
۱۵/اگست، ۱۹۵۵ء جلد ۱۰ نمبر ۸
۱۵/اگست، ۱۹۵۱ء جلد ۶ نمبر ۸
۱۵/اگست، ۱۹۵۶ء جلد ۱۱ نمبر ۸
۱۵/اگست، ۱۹۵۲ء جلد ۷ نمبر ۸
۱۵/اگست، ۱۹۵۷ء جلد ۱۲ نمبر ۸

اس اعتبار سے ممتاز و معروف محقق جناب عرفان عباسی صاحب کا یہ تحریر کرنا یقیناً بالکل صحیح اور حق بجانب ہے کہ ''ماہنامہ نیا دور لکھنؤ کا جون، ۱۹۵۶ء کا شمارہ پیش نظر ہے، جس کے سرورق پر جلد نمبر ۱۱ اور شمارہ نمبر ۶ درج ہے۔ اس اندراج کے مطابق نیا دور کا سال اشاعت یقینی طور پر ۱۹۴۶ء قرار پاتا ہے۔۔۔۔ 'اطلاعات' جنوری ۱۹۴۹ء کا پہلا شمارہ، جس پر جلد نمبر ۴ اور شمارہ نمبر ۱ درج ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جریدہ کا اجراء بھی (یکم جنوری) ۱۹۴۶ء میں ہی ہوا تھا۔'' (نیا دور، لکھنؤ، نصف صدی نمبر، صفحہ ۸۹-۸۸)

مزید برآں 'اطلاعات' اور 'نیا دور' کے مدیر، جناب صباح الدین عمر صاحب کے انتقال کے بعد اتر پردیش اردو اکادمی کے دو ماہی جریدہ 'اکادمی'، لکھنؤ کے ''صباح الدین عمر نمبر'' کے پہلے ہی مضمون میں علی جواد زیدی صاحب رقمطراز ہیں کہ ''محکمہ اطلاعات سے ایک مخصوص ہفت روزہ اردو میں بھی نکالا گیا۔ غالباً ''جنگ کی خبریں'' یا ''دیش پکار'' تھا۔ اس کی ادارت صباح الدین عمر صاحب کے سپرد ہوئی۔ اس میں جنگ کی خبروں پر توجہ تو دی ہی جاتی تھی۔ لیکن کچھ نظمیں اور غزلیں وغیرہ بھی دے دی جاتی تھیں۔''

(دو ماہی اکادمی صباح الدین عمر نمبر، ایڈیٹر شمیم رضوی، صفحہ ۱۵)

علی جواد زیدی صاحب اپنی متذکرہ عبارت کے آغاز میں ہی 'غالباً' لکھ کر کے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ان دونوں اخبارات کی اشاعت قطعی طور پر مشکوک اور مشتبہ ہو جاتی ہے۔

یاد رہے کہ صوبۂ متحدہ کے انگریز گورنر، سر ہارکورٹ بٹلر لکھنؤ کی دلکشی سے اس قدر مسحور ہوئے اور سیاسی ماحول نے انھیں اپنی جانب اتنا کھینچا کہ انھوں نے اپنا دارالحکومت ۱۹۲۱ء میں الہ باد سے رفتہ رفتہ لکھنؤ منتقل کر لیا۔ اب ایوانِ گورنر، ایوانِ حکومت اور ایوانِ قانون ساز لکھنؤ میں ہیں۔ الہ باد میں صرف ہائی کورٹ، اکاؤنٹینٹ جنرل، کے دفاتر، پبلک سروس کمیشن اور بعض دیگر محکمہ جاتی دفاتر مثلاً تعلیمات پولس وغیرہ کے دفاتر رہ گئے ہیں۔ بورڈ آف ریونیو کا عدالتی شعبہ الہ باد میں اور انتظامی شعبہ لکھنؤ میں ہے۔ سر بٹلر نے ہی، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، صوبۂ متحدہ کا نام 'یونائیٹڈ پراونسس (یو پی)' رکھا تھا، جو ۲۶ جنوری، ۱۹۵۰ء کو یومِ جمہوریہ کے موقع پر ہمارا ملک ہندوستان جمہوریۂ ہند بن گیا اور ہماری ریاست 'اتر پردیش' کے نام سے موسوم کی گئی۔ یہی وہ سنہری موقع تھا، جب ہمارے محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ سے جاری ہونے والے اردو ماہنامہ اطلاعات صوبۂ متحدہ یا نیا دور کا نام تبدیل کر کے 'اتر پردیش' رکھ دیا گیا۔ اسی طرح ہندی ماہنامہ 'سماچار' اور ماہنامہ 'ترپتھگا' کا نام تبدیل کر کے 'اتر پردیش' رکھ دیا گیا، جو آج تک جاری ہے۔ اسی طرح انگریزی ماہنامہ 'انفارمیشن' کا نام بدل کر اتر پردیش رکھ دیا گیا، جس کے مدیر صباح الدین صاحب مقرر ہوئے۔ لیکن اردو ماہنامہ اتر پردیش اور انگریزی ماہنامہ اتر پردیش ہمیشہ کے لئے معرضِ التوا میں پڑ گئے۔

□□□

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد بحیثیت اداریہ نگار

فضل الرحمن اصلاحی
دارالمصنفین شبلی، اعظم گڑھ
موبائل: 9616349240

پروفیسر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے بلا شبہ ایک بلند پایہ شاعر اور بین الاقوامی ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے بیحد مقبولیت اور شہرتِ دوام حاصل کی، اسی طرح سب جانتے ہیں کہ وہ ایک اچھے اور قادر القلم نثر نگار بھی تھے، اُن کے نثری اکتسابات بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد پر ان کا تحقیقی مقالہ اس پر شاہد عدل ہے، مگر بصد افسوس مرحوم کی دوسری حیثیتیں اُن کی گراں پلہ نثر نگاری کے لیے حجاب بن کر رہ گئیں، اقبال سہیل مرحوم کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا رہا، اُن کو بھی دنیا نے ایک بلند پایہ اور برجستہ گو شاعر کی حیثیت سے زیادہ جانا پہچانا، اور اُنکی دل کش نثر نگاری دب کر رہ گئی، چنانچہ جب مرحوم کی ''سیرت شبلی'' راقم کی تدوین و تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی تو ریاض الرحمن شیروانی نے کانفرنس گزٹ علی گڑھ میں اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''ہم نثر نگار اقبال سہیل سے واقف نہیں تھے، اب جو زیر تبصرہ کتاب پڑھی تو اُنکی شاعری میں بھی مزا نہ رہا''۔ (شمارہ فروری ۲۰۱۶ء)

بلا شبہ ملک زادہ کی شخصیت اور اُن کے متنوع کمالات بجا طور پر اس کے مستحق ہیں کہ اس کو جامعاتِ ہند میں ریسرچ و تحقیق کا مستقل موضوع بنایا جائے، تا کہ ہماری ادبی تاریخ میں مرحوم کو قرار واقعی مستحق مقام دیا جا سکے۔ راقم الحروف نے پیش نظر تحریر میں ملک زادہ مرحوم کی نثر نگاری کا اجمالی جائزہ لینے کی ایک کوشش کی ہے، مرحوم ڈاکٹر ملک زادہ رہتی زندگی ماہنامہ ''امکان'' لکھنؤ کے اداریے لکھتے رہے، جو اپنے ظاہری و معنوی محاسن کے اعتبار سے مرحوم کی نثر کے اعلیٰ نمونے ہیں، مثلاً مرحوم ایام حج کی مناسبت سے دسمبر ۲۰۰۶ء جنوری ۲۰۰۷ء کے شمارے میں خطبہ حجۃ الوداع کے موضوع پر اداریہ لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''جس وقت امکان کا یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا، دنیا کے مختلف ممالک کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد فریضہ حج ادا کر رہی یا کر چکی ہوگی، صدیوں پہلے نبی کریم اپنے آخری حج کے موقع پر مسلمانوں کو مخاطب کر کے ایک خطبہ دیا تھا، جو ''خطبہ حجۃ الوداع'' کے نام سے معروف ہے، یہ خطبہ جو تمام عالم انسانیت کے لیے ایک منشور اعظم کی حیثیت رکھتا ہے، اسی کو میں اگلے صفحات پر بطور اداریہ میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ لوگو! ڈرتے رہو اپنے اللہ سے، ضمن میں بیویوں کے کہ اللہ کے نام کی ذمہ داری سے بیوی بنایا ہے تم نے انھیں، حق تمہارا ہے ان پر تو بس اتنا ہے، بستروں پر تمھارے کوئی غیر محرم وہ آنے نہ دیں، جو وہ ایسا کریں، غیر تکلیف دہ مار مارو انھیں اور تم پر یہ حق عورتوں کا بھی ہے، کھانا دو، کپڑا دو، ان کو مقدور بھر۔''

عصر حاضر میں اکثر ملک اور بیرون ملک جو مہتم بالشان سیمینار اور مجالس مباحثہ کا انعقاد ہوتا رہتا ہے، بصد حسرت! اُن کے منتظمین کے سامنے کوئی متعین ہدف یا ٹھوس مقصد نہ ہونے کے باعث عموماً یہ سب بے روح اور ''نشستن و گفتن و برخاستن'' کا مصداق رہتے ہیں، اور ان کا کوئی بھی خاطر خواہ مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ہے، ڈاکٹر ملک زادہ مرحوم ایسی ذہنیت پر مثبت انداز میں تنقید کرتے ہوئے ایک اداریے میں لکھتے ہیں:

''چند برائے نام مستثنیات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو ملک کے مرکزی شہروں میں ہونے والے مذاکرات کا موضوع وہ شعراء اور ادباء ہیں جن پر ہمارے قلم کاروں نے بہت کچھ پہلے ہی لکھ رکھا ہے، نتیجہ میں جب ان پر کوئی نیا مقالہ لکھا جاتا ہے تو عموماً پہلے لکھے گئے مقالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے، اور مقالہ نگار ماضی میں لکھے گئے مقالات کے مرکزی تصورات کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے، اور کوئی نیا منظر نامہ اُبھر کر سامنے نہیں آتا''۔ اس کی چند سطروں کے بعد پھر رقمطراز ہیں: ''سیمیناروں میں ایک دوسری مجبوری سامعین کے لیے یہ بھی ہے کہ وقت کی کمی یا موضوع کی طوالت کے باعث دو ایک مقالوں کے بعد صدر مجلس کو یہ حکم صادر کرنا پڑتا ہے کہ مقالہ نگار حضرات کا جو ''بامعنی اور پُر مغز دور'' ابتدا میں چلا تھا، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے''۔ (بحوالہ سابق)

راقم کے نزدیک اُردو کے مسئلہ میں اکثر لوگ افراط و تفریط کا شکار ہو کر راہ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں، ہم نے محبان اردو کے لبادہ میں ایسے لوگ کثرت سے دیکھے ہیں، جن کی روزی روٹی اگر چہ اُردو زبان سے وابستہ ہے، لیکن بایں ہمہ وہ خود اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، علاوہ ازیں یہ کتنے عیب کی بات ہے کہ ایسے لوگ اُردو کے فروغ کے لیے

ایک اردو کا اخبار یا رسالہ خرید کر نہیں پڑھ سکتے، اور ''مفت خوری'' کے عادی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایسے نام نہاد محبان اردو کے غیر ذمہ دارانہ رویہ سے اردو کے فروغ کو غیر معمولی نقصان پہونچ رہا ہے، سچ بتایئے! کیا ہم اس کے لیے خود قصوروار نہیں ہیں؟؟ جہاں تک اردو کے تیئں حکومتی رویہ کی بات ہے، تو اس پر تو صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

'غالب پہ کرم کر کے اردو پہ ستم کیوں ہو'

پروفیسر ملک زادہ مرحوم بلاشبہ اردو کے شیدائی تھے، حالانکہ اُن کو انگریزی زبان میں بھی یدطولی حاصل تھا، اور ایک عرصہ دراز تک وہ مختلف تعلیمی اداروں میں انگریزی زبان وادب کی تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، مگر بایں ہمہ مرحوم نے جس اخلاص ولگن اور جس فنائیت کے ساتھ قافلہ اردو کی حُدی خوانی میں قائدانہ رول ادا کیا، وہ ہماری ادبی تاریخ میں یادگار رہے گا چنانچہ اسی خصوص میں اُن کا درج ذیل اداریہ بعنوان ''خدا ہماری خوش فہمیوں کو سلامت رکھے'' ملاحظہ فرمائیں:

''ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ اُردو بحیثیت زبان آزادی کے بعد روز بروز کمزور ہوتی جارہی ہے، الفاظ اپنے معنی بدل رہے ہیں، تلفظ غیر معتبر ہوتا جارہا ہے، اردو تقریبات اور مذہبی تقریبات کے بیشتر اردو کے بجائے دوسری زبانوں کے رسم الخط میں لکھے جارہے ہیں، اور اب قبرستانوں میں بھی اردو رسم الخط میں لکھے ہوئے ''لوح مزار'' بھی شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں، اور وہ دن دور نہیں ہے جب ہماری نئی نسل کے لیے اردو رسم خط ایک نامانوس سوالیہ نشان میں تبدیل ہوجائے، اور ہمارے بچے علوم جدیدہ ہی نہیں بلکہ معقولات اور منقولات بھی دوسرے رسم خط میں پڑھ کر اردو کو رفتہ رفتہ بھول جائیں''

واقعہ یہ ہے کہ اُردو کاز کے لیے اُنکی تحریریں خون جگر سے لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ آزادی وطن کے بعد اُردو زبان کی بپتا خود اُن ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

''آزادی کے بعد اتر پردیش اور دہلی سے ملحقہ علاقوں کو اُردو کا علاقہ تسلیم کرانے کے لیے انجمن ترقی اردو کی سربراہی میں ۲۲ لاکھ دستخطوں کا ایک محضر عوامی جذب وشوق نے تیار کیا تھا، جسے ذاکر حسین صاحب نے صدر جمہوریہ ہند کو پیش کیا تھا، مگر تفصیلات میں گئے بغیر اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا، اور ہمارے سہل پسند دانشور یہ کہنے لگے حکومت سے مراعات طلب کرنے کے بجائے ہمیں اپنے بچوں کو خود اردو پڑھانا چاہئے، اور کسی احتجاجی رویہ کو اختیار کرنے کے بجائے اپنے مطالبات حکومتوں کے سامنے پیش کرنے چاہیں، جن کے گھروں میں بجلی پانی نہیں آتا تھا تو وہ سڑکوں پر احتجاج کے لیے نکل آتے تھے، مگر اردو کے لیے یہ کبھی گھروں سے باہر نہیں نکلے، اور اگر کچھ سر پھرے نکل بھی پڑتے تھے تو یہ ان کی مخالفت میں آوازیں اٹھا کر حکومتوں کے منظور نظر بن کر پدم شری اور پدم بھوشن کے اعزازات سے سرفراز ہوتے تھے، اور جمہوریت میں اردو کی ہر عوامی تحریک کو نقصان پہونچاتے رہے، یہ سہل پسند دانشور یہ بھی بھول گئے کہ اردو پڑھانے کا مطالبہ اردو والوں کی اس اکثریت یعنی مسلمانوں سے کیا جارہا ہے، جس نے اپنے سات سو سالہ ہندوستانی دور اقتدار میں اپنی مذہبی زبان عربی بھی اپنے بچوں کو نہیں پڑھائی، اور جو سرکاری زبان تھی اسی کو پڑھاتے رہے، اور آج بھی ابتدائی اور ثانوی سطح پر ملک کی سرکاری زبان کو پڑھا رہے ہیں۔''

(امکان جولائی اگست ۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر افضل حسین نے اپنی کتاب ''اردو صحافت آزادی کے بعد'' میں مولانا آزاد پر کچھ سطحی قسم کے اعتراضات کئے تھے پروفیسر ملک زادہ ان اعتراضات کا مسکت جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مقالہ نگار کی رائے میں مولانا جھوٹے ہیں اور تمام محققین سچے ہیں۔ مولانا آزاد نے اپنے رسالہ 'الہلال' ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء میں ایک گم نام خط کے جواب میں لکھا تھا'' آپ پوچھتے ہیں کہ مغرب و مشرق کے کس دارالعلوم میں ادنیٰ یا اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، گزارش ہے کہ الحمد للہ کسی میں نہیں، البتہ رب المغربین ورب المشرقین کی اس درس گاہ سے فیض یاب ہوں۔ جب اس درس گاہ الٰہی کا دروازہ مجھ پر کھل گیا تمام کاغذ کی سندیں دینے والے دارالعلوم میں بے نیاز ہوگیا ہوں''۔

پروفیسر ملک زادہ مرحوم کے اداریے بنیادی طور سے اردو شعر وادب نیز اردو زبان کے فروغ کے لئے وقف تھے وہ بڑے ہی جامع انداز میں اردو کے مسائل پر قلم اٹھاتے اور ان کے حل کے لئے مختلف طرح کی تدابیر سوچتے تھے۔

ملک زادہ منظور بعض دفعہ منظوم اداریہ بھی تحریر فرماتے تھے مثلاً ذیل میں امکان فروری و مارچ ۲۰۰۷ء کا منظوم اداریہ ملاحظہ فرمائیں۔ جو آج کے حالات کی بڑی عمدہ تصویر کشی کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

صحیفۂ نو برنگِ قول وقرار اُترا تو میں نے دیکھا
فریب وعدہ وہی تھا، جو بار بار اُترا تو میں نے دیکھا
تمام جھوٹی تسلّیوں کی جو تھیں تو بے رنگ سلوٹیں تھیں
جب اسکے چہرے سے غازۂ اعتبار اُترا تو میں نے دیکھا
مرے فریب نظر نے اس کو بلند قامت بنا دیا تھا
وہ اتفاقاً جو بام سے ایک بار اُترا تو میں نے دیکھا
تمام میکش تھے پیاسے پیاسے بس ایک ساقی بہک رہا تھا
شب گزشتہ کا صبح دم جب خمار اُترا تو میں نے دیکھا

مجموعی اعتبار سے پروفیسر ملک زادہ کے اداریوں کو افادۂ عام کی خاطر شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ ان سے استفادہ کرسکیں۔

□□□

غزل

ہر موج غم کو ہم نے کنارا بنا لیا
تیرے غموں کو ہم نے سہارا بنا لیا

جو سانپ بن کے ڈستے رہے ہیں ہمیں سدا
ان کو بھی ہم نے اپنا دلارا بنا لیا

میرا قصور ہے تمہیں اپنا سمجھ لیا
دشمن کو دیکھو جان سے پیارا بنا لیا

مطلب پرست تم رہے، کیا اس کا غم کریں
ہم نے تو تم کو آنکھ کا تارا بنا لیا

ہو جس کے ساتھ غیبی مدد اس کو کیا خطر
موج بلا کو اس نے کنارا بنا لیا

آصفہ زمانی
چیرپرسن اردو اکادمی، A-4/83، وشال کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ
موبائل: 9621914069

کس سفر پر ہیں رواں ہم لوگو، وقت آہٹ نہ صدا چاہتا ہے
کوئی منزل ہے نہ قدموں کے نشاں راستہ ختم ہوا چاہتا ہے

کوئی بتلائے کہ یہ زیست کا لفظ، ہم سے بے لفظ سے کیا چاہتا ہے
رات پلکوں پہ رکا چاہتی ہے خواب آنکھوں سے بہا چاہتا ہے

اپنے ہونے کی بشارت یوں بھی دنیا والوں کو دیا چاہتا ہوں
خواہ آواز ہو، سناٹا ہو واہمہ کوئی قبا چاہتا ہے

دیدِ بے دید سے حیران کیا ہجر کے کرب سے تڑپا ڈالا
آنکھ پیاسی تھی سو اشک اس کی غذا، دل کہ مجرم ہے سزا چاہتا ہے

یاس گزری تھی بگولے کی طرح دھند سمتوں سے نہ اتری برسوں
آس آئی دبے قدموں شاید رنگ خوشبو میں گھلا چاہتا ہے

حبس اور جہل کے اس پردے میں ہے کوئی آنکھ جو روزن کر دے
برگِ ادراک تڑپنے کے لیے ایک تھوڑی سی ہوا چاہتا ہے

شہپر رسول
صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
موبائل: 9891721184

اپنے اپنے طوطے

اقبال مجید
سورج فارمس، مکان نمبر ۲، ائیر پورٹ روڈ، بھوپال
موبائل: 9893764746

پوپلے منہ، سفید بالوں اور جھکی کمر والی دو بڑھیاں پاس پاس رہتی تھیں، ایک دیوار کے ادھر اور دوسری دیوار کے اُدھر۔ ایک کا نام گلابو تھا اور دوسری کا شابو۔ بیچ کی دیوار اونچی نہ تھی زمین پر بالٹی اوندھا کر دیوار کے سہارے کھڑے ہونے پر دوسری طرف گھر میں کیا ہو رہا ہے یہ دیکھا جانا کوئی دشوار نہ تھا۔ کون آیا، کون گیا، گلابو کیا کر رہی ہے ان سب باتوں کی خبر ایک دوسرے کو رہا کرتی تھی۔

گلابو کے پاس ایک زنگ خوردہ پنجرہ تھا جس میں نہ جانے کب سے ایک طوطا پلا ہوا تھا، دن بھر بنی جی بھیجو، پکارتا یا سیٹیاں بجاتا مگر بولتا صاف تھا۔ شابو کے پاس ایک شریف النفس مینا تھی جس کو بڑھیا دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے جلی کٹی سنایا کرتی مگر مینا ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی مگر جیسے ہی بڑھیا گھر سے باہر نکلتی مینا پنجرے سے آواز مارتی ''جا رہی ہو۔'' بڑھیا جواب دیتی ''چل ہٹ مردار''۔

گھوڑوں کا کاروبار کرنے والے ایک رئیس کی بیوی نے دونوں بڑھیوں کو اپنے میاں کے لق و دق اصطبل کے ایک کمرے میں درمیان میں دیوار کھینچ کر اس لئے ڈال لیا تھا کہ وقت بے وقت کام آئیں گی۔ بڑھیاں گھاگ تھیں، جانتی تھیں کہ ڈیوڑھیوں کی شادابی دھیرے دھیرے مرجھا رہی ہے اس لئے تن بہ تقدیر جو حصے میں آرہا تھا اُسی پر شکر ادا کرتیں۔

کچھ دنوں میں شابو کو یہ سن گن لگی کہ گلابو کے گھر میں چلتی پرزہ اور بدنام زمانہ بی جمالو کا آنا جانا روز کا معمول بن گیا ہے۔ بی جمالو معمولی چیز نہ تھیں، آسمان میں تکلی لگاتی تھیں۔ ایک دن جب جمالو کے آنے کی آہٹ ملی تو شابو جھٹ دیوار سے بالٹی اوندھی لگا کر کھڑی ہوگئیں اور اُس پار کا بھید لینے لگیں، دیوار کے پاس ہی کھاٹ بچھائے گلابو اور جمالو بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

گلابو: اے بہن جمالو کوئی راستہ بتاؤ کہ ہمارا بھی مقدر پلٹے اور اچھے دن آئیں، کہا تھا سوچ کر بتاؤں گی۔ بھلا کچھ سوچا''؟

جمالو: سوچا تو ہے۔

گلابو: کیا سوچا؟ بتاؤ نا۔

جمالو: تمہارے پاس ایک طوطا ہے۔

گلابو: طوطا؟ ہے تو مگر وہ کس کام کا؟

جمالو: وہی کہہ رہی ہوں اُسے کام پر لگاؤ۔

گلابو: زیادہ سے زیادہ بنی جی بھیجو' سکھا سکتی ہوں، سو وہ دن بھر رٹتا رہتا ہے۔

لمبی بات چیت کے بعد جمالو اور گلابو میں یہ طے پایا کہ بہت سوچ سمجھ کر طوطے کو ایسے سبق سکھائیں گی جن سے چار پیسے کمائے جا سکیں۔ وہ لوگ جو ڈوبتے میں تنکے کو بھی سہارا سمجھ کر پکڑ لیا کرتے ہیں، ایسے لوگ طوطے کو غیبی طاقت کا مالک سمجھنے لگیں گے۔ مرادیں مانگیں گے، چڑھاوے چڑھائیں گے، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں شابو جمالو پر صدقے قربان ہوگئی۔ تب جمالو نے شرط رکھی۔ جب طوطے کو سکھائے سبق کچھ پھل دینا شروع کر دیں تو ہر روپے پر میں پیسے کی حقدار بی جمالو بھی ہو جایا کریں گی۔ یہ سن کر شابو کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ دن رات گلابو کے آنگن کی طرف کان لگے رہے لیکن بی جمالو اندر کے کمرے میں طوطے کو جو ریاض کراتیں اس کا کچھ پتا نہ چلتا، کچھ ہی عرصے میں گلابو کے یہاں کیا ہو رہا ہے اس کا پتا لگانے کے لئے شابو آخر بے صبری سے اس کے گھر پہنچ ہی گئیں، جیسے ہی انھوں نے ٹوٹے پھوٹے برآمدے کی طرف بڑھنا شروع کیا تو ایک دھنی میں لٹکے پنجرے کی طرف سے آواز آئی۔

''آؤ خوش نصیب آؤ'' شابو حیران پنجرے کے پاس جا کر بت بنی کھڑی رہ گئیں کہ طوطا گردن کے بال پُھلا کر بولا۔

''مانگو۔ ملے گا۔ مانگو ملے گا''

شابو نے دیکھا کہ گلابو کے بدن کا لباس بھی طوطے جیسا ہو گیا ہے یعنی سبز جمپر پر لال دوپٹہ۔ کچھ دنوں بعد گلابو کے گھر سے لوبان کی خوشبو آنا شروع ہوگئی۔ طوطے کا پنجرہ بیلے کے ہاروں سے ڈھکنے لگا۔ اب طوطے کو نیا سبق سکھایا گیا تھا۔

''بیٹھئے۔ میاں مراد پوری کریں گے''۔ یا پھر طوطا آنے والوں کو ڈانٹتا۔

''واپس جاؤ، کچھ نہیں ملنے کا''

شابو نے شدت سے محسوس کیا کہ گلابو کا لباس ہی نہیں اس کی آواز بھی طوطے جیسی کڑکیلی اور پتلی سی نکلنے لگی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے گھر کا دروازہ بھی طوطے کے رنگ کا رنگوا لیا تھا جبکہ اصطبل کے مالک

اسمٰعیل خٹک نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر کہیں بھی کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ لیکن دروازے کا رنگ ہی نہیں بدلا گیا تھا بلکہ دروازے کی چوکھٹ پر ایک بورڈ بھی نصب کیا گیا تھا جس پر لکھا تھا ''طوطا بابا آشرم'' شابو کو چین کیسے ملتا۔ برقع اوڑھ اسمٰعیل خٹک کی بیوی سے بھید لینے پہنچ گئی۔ وہاں اس کو بیگم خٹک سے جو کچھ معلوم ہوا اس سے اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے مثلاً یہ کہ دروازے رنگنے اور بورڈ لگانے کی اجازت خود بیگم خٹک نے گلابو کو دی ہے۔ یہ کہ وہ لاولد تھی لیکن طوطے کی کرامات نے اس کی جھولی بھرنے کا معجزہ ڈاکٹرنی کے ذریعے سنا دیا ہے، یہ ماجرا سن کر شابو الٹے پیروں گلابو کے گھر گئی تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ برآمدے میں لکڑی کے دو کشادہ تخت بچھے ہوئے تھے جن پر بے داغ سفید چاندنی اور گاؤ تکیوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ کچے آنگن میں زمین برابر کر کے پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ قلعی کیا ہوا ایک نقشی پاندان جو کم سے کم پانچ کلو تانبے کے وزن کا رہا ہوگا تخت کے ایک کونے پر آنے والی بیبیوں کی ضیافت کے لئے رکھا تھا جسے شابو نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ بیگم خٹک کے گھر کا ہے۔ شابو کی نظر اخبار کے اس اشتہار پر بھی پڑی جس پر لکھا تھا۔

''مراد مانگنے والے مایوس نہ ہوں، طوطا بابا سے مانگیں، اصطبل نزد چھاؤنی''۔

شابو جب گھر سے باہر جھانک جھانک کر دیکھتی تو دن بہ دن اسے میدان میں اسکوٹروں موٹر سائیکلوں اور کاروں کی بھیڑ بڑھتے ہوئے دکھائی دیتی۔ پھر اس نے دیکھا کہ اسمٰعیل خٹک کے کارندوں نے سواریوں سے اُس زمین پر گاڑیاں وغیرہ کھڑی کرنے کا کرایہ لینا شروع کر دیا۔ بی جمالو کو دھیرے دھیرے یہ اندازہ ہونے لگا کہ طوطے کی مقبولیت کچھ اتنی بڑھ رہی ہے کہ شہر کے بڑے لوگوں کے دانت اس پر لگنا شروع ہو گئے ہیں۔ اسمٰعیل کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی تھی۔

مہرن سیانی اور سمجھدار تھی گلابو کے گھر پیسے کی ریل پیل دیکھ کر وہ حیران تھی۔ ایک دن مہرن کو گلابو مال میں مل گئی۔ ٹی وی کا جدید ترین ماڈل گلابو نے اسی وقت خریدا تھا جو پیک کیا جا رہا تھا۔ گلابو جینس اور ٹاپ میں تھی۔ پیروں میں اٹلی کی قیمتی نوک دار ہیل والی سینڈل تھی۔ مہرن اس کے آگے ملازمہ لگ رہی تھی۔ مہرن کو دیکھتے ہی اُس نے فریاد کی۔

''بی بی تمہارے باپ نے میری آمدنی بند کر دی۔ تھوڑے سے پیسے دیکر طوطے کے حقوق لکھا پڑھی کر کے اپنے نام لکھوا لئے۔ میں ان پڑھ بڑے لوگوں کے جھانسے میں آ گئی۔ یہ کہہ کر گلابو چل دی۔ مہرن اس کی چال کو غور سے دیکھتی رہی۔ اونچی ایڑی کی سینڈلوں نے اس بڑھیا کی جس کا سر قیمتی شیمپو سے دھلکر چمک رہا تھا میں ارسٹوکریسی کی ایسی خوشبو پیدا کر دی تھی کہ مہرن اسے محسوس کر کے دنگ رہ گئی۔

ایک دن مہرن کچھ بیمار پڑ گئی تو شب باشی کے لئے اس کے پاس رہنے کے واسطے شابو کو گھر بلا لیا گیا۔ شابو رات مہرن کے کمرے میں لیٹی تھی برابر کا کمرہ مہرن کے باپ کا تھا جہاں اس وقت لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ شابو نے دیکھا کہ اس آوک جاوک کے درمیان بی جمالو بھی اسمٰعیل خٹک سے ملنے گئی اس وقت مہرن سو چکی تھی شابو نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ بیگم خٹک کہہ رہی تھیں۔

''جمالو۔ تم اسمٰعیل کو اپنا مقدمہ بتاؤ''

جمالو: کیا بتاؤں حضور۔ گلابو اور میرے درمیان طے ہوا تھا کہ جب طوطے بابا کا کام چل نکلے گا تو ان پر جو بھی نقد چڑھاوا چڑھے گا اس پر فی روپیہ بیس پیسہ کمیشن مجھے حق محنت کے طور پر ملے گا مگر ابھی تک گلابو نے صرف دو سو روپے دیئے ہیں۔ اسمٰعیل سنتے ہی بھڑک اُٹھے۔

اسمٰعیل: کوئی کمیشن نہیں۔ طوطا اب کمپنی کا نوکر ہے۔ خاص بڑی کمیٹی بنائی گئی ہے۔ نقد چڑھاوے کے لئے سیل بند بکسے کمپنی کی طرف سے رکھے جائیں گے۔

جمالو: لیکن حضور میری محنت۔

اسمٰعیل: کیسی محنت؟

جمالو: میں نے ہی تو طوطے کو سکھایا ہے حضور۔

اسمٰعیل: تم کو معلوم ہے کمپنی اب تک پانچ لاکھ روپیہ صرف طوطے بابا کی پبلسٹی پر خرچ کر چکی ہے۔ آئندہ سے تمہاری کارکردگی کو دیکھ کر تنخواہ دی جائے گی ورنہ کسی دوسرے ٹرینر کو رکھ لیا جائے گا۔ ہزار روپے تم مجھ سے لے لو، اسمٰعیل نے نوٹ پکڑا کر بی جمالو کو کمرے سے رخصت کر دیا، شوہر کو اکیلا پا کر بیگم خٹک اداسی سے بولی۔

بیگم خٹک: اب تو تمہیں طوطے کے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں، نہ وقت پر کھاتے ہو نہ سوتے ہو، ڈائبٹیز اور بلڈ پریشر کا موذی مرض لے کر بیٹھ گئے ہو، بات بات پر غصہ کرتے ہو، میرے اوپر ہاتھ اُٹھانے لگے ہو۔

اسمٰعیل: گلابو شابو کو جگہ میں نے اپنے اصطبل میں دی۔ طوطے اور اس کی مالکن کی آبادکاری میرے ہاتھوں ہوئی اور جب لوگوں نے دیکھا کہ طوطا ایک ٹکسال میں بدل سکتا ہے تو وہ اس کو مجھ سے چھین لینے کے درپے ہو گئے۔ خزانہ مل جانا آسان ہے مگر خزانے کی حفاظت جان پر بن آتی ہے۔ طوطے کو ان جوکھموں سے بچانے میں مجھ پر کیا گزری ہے اب تم کو کیسے بتاؤں۔ پچاس لاکھ روپے طوطے بابا کی پبلسٹی کے لئے رکھے جائیں گے۔ میدان کے مغرب میں زائرین کے لئے بینک سے قرض لیکر سرائے بنوانے کا پروگرام ہے یہ کہہ کر اسمٰعیل کمرے سے چلا گیا۔

شابو نے مہرن کے پاس لیٹے لیٹے اس کی باپ کی یہ باتیں سن کر ٹھنڈی سانس لی۔ مہرن بہ ظاہر سوتی پڑی تھی اس لئے صبح جب اس کا منگیتر اقتدار عالم اس

سے ملنے آیا تو مہرن نے ساری باتیں اسے بتا دیں جسے سن کر اقتدار عالم کو ذرا بھی تعجب نہ ہوا، اس نے مہرن کو سمجھایا کہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اسمٰعیل طاقت کا بھوکا ہے۔ طوطے کے ذریعے بڑھتی آمدنی پر قبضے کے لئے طاقت کے جس ڈھانچے کی تعمیر کے دوران لہولہان ہونا پڑتا ہے اسمٰعیل کے لئے اتنا لہولہان ہونا بھی ضروری تھا کہ اس کے مرکز میں وہ پوری طاقت سے خود کو موجود اور محفوظ رکھ سکے۔

اقتدار عالم۔ ایم ایل اے تھا، سیاسی آدمی ہونے کے سبب آنکھیں کھلی رکھتا تھا۔ اپنے ہونے والے سسر اسمٰعیل خنک کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ وہ طاقت کا دیوانہ ہے۔ اقتدار کی شروع سے اس بات پر نظر تھی کہ اسمٰعیل طوطے کو قابل فروخت بنانے کے لئے کتنا بڑا پاور اسٹرکچر دھیرے دھیرے کھڑا کر رہا ہے۔ سیاست میں ہونے کے سبب اقتدار عالم کو یہ بھی معلوم تھا کہ سرکار قبائلیوں کی اصلاحی اور فلاحی اسکیموں کی پشت پناہی کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ ایک دن اُس نے بی شابو کو مہرن کے سامنے روتے ہوئے دیکھ لیا۔ رونے کی وجہ پوچھی تو وہ بولی ''میاں میری قسمت میں ہی رونا ہے۔ ورنہ میرے پاس بھی ایک مینا ہے، پٹر پٹر بولتی ہے، ایک گلابو کا طوطا ہے کیا قسمت لے کر آیا ہے''۔ یہ سن کر مہرن کے منگیتر کے دل میں ایک بڑا اچھوتا خیال آیا، اس خیال کو اس نے آدی واسی منترالیہ کے کچھ دوستوں سے بیان کیا۔ جب بعض لوگوں نے اس کی ہمت افزائی کی تو اُس نے اپنا پلان مہرن سے بیان کیا۔ مہرن بہت گھبرائی، بولی۔

''یہ نہ کرو۔ میرا باپ سمجھے گا کہ تم اس کی مقابلہ آرائی پر اتر آئے ہو''۔

لیکن اقتدار عالم نہیں مانا بی جمالو کو بلوا بھیجا۔ وہ آئی تو بڑی رازداری سے پوچھا۔

''جیسے تم نے گلابو کے طوطے کو پڑھایا ہے۔ کیا شابو کی مینا کو بھی پڑھا سکتی ہو؟ بی جمالو جلی بھنی بیٹھی تھیں، تنک کر بولیں ''اے بیٹا طوطے کو پڑھا کر اس بڑھیا کو کیا ملا جو مینا کو پڑھا کر ملے گا۔ کمائی تو دوسرے کھا رہے ہیں''۔

''تم اس کی فکر نہ کرو میں تمہیں پیشگی کچھ رقم دونگا اور ماہوار تنخواہ بھی لیکن ہم مینا کو تیار کرنے میں اب نئی ٹیکنالوجی کی مدد بھی لیں گے''۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، نئے استادوں کے ساتھ بی جمالو بھی مینا کو پڑھانے میں لگ گئیں۔

طوطے کے بھگتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اسمٰعیل اور اس کے ساتھیوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ طوطے کے باؤ بھاؤ میں کچھ نئے اضافے کرنے کے لئے ماہرین کی ایک خاص کمیٹی بنائی گئی جس کی سفارشات کی رو سے طوطے کی شخصیت میں تھوڑی فقیری کی شان پیدا کرنا بازار کی ضرورتوں کے اعتبار سے کافی منفعت بخش بتایا گیا تھا۔ ایسے دو ماہرین تلاش کر لئے گئے جو طوطوں میں روحانی خصوصیات اُبھارنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں خبر آئی کہ طوطا موسیقی کے بعض ٹکڑوں پر حال اور قال کی کیفیت میں مبتلا ہونے لگا ہے۔

ایک خبر تو یہ بھی تھی کہ پرندوں میں Genetic Engineering کے تجربے کرنے والے ڈاکٹروں کے پاس طوطے کو مہینے میں تین بار لے جایا جاتا ہے۔ اب طوطا سوالی کا جواب دینے سے پہلے آنکھیں بند کر کے اور گردن آسمان کی طرف اُٹھا کر دو پل دیکھتا ہے۔ پھر گردن نیچی کرتا ہے آنکھیں کھولتا ہے اور جواب دیتا ہے ''ملے گا۔ ملے گا'' اس کے بعد ریکارڈ کی ہوئی آرکسٹرا کی دُھن بجتی ہے۔ یہ عشق عشق ہے عشق عشق اور اس دُھن پر طوطا مجذوب کی طرح اپنے دونو بازو ہوا میں اُٹھا کر رقص کرتا ہے، اب وہ کافی بڑے اور خوبصورت پنجرے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

دراصل بنیادی حقوق اور سماجی انصاف کے اداروں کی جن خواتین اراکین سے اقتدار عالم کی دوستی تھی ان کے ذریعے اقتدار کو مقامی آدی باسیوں کی بدحالی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس طبقے کے پچھڑے پن، جہالت، روایت پسندی، شراب نوشی، خاندانی تشدد وغیرہ جیسی بدعتوں کی اصلاح کے لئے قدم اُٹھانے کی کارگر کوششوں کے لئے اقتدار کے دل میں اس جذبے سے زیادہ کمائی کا راستہ نکالنے کی فکر بھی تھی۔ اس طبقے کے عام لوگوں کے خواب اور محرومیوں کی تفصیلی چھان بین کے اعداد و شمار اقتدار عالم نے حاصل کر لئے تھے ۔مہرن اپنے منگیتر سے چاہتی تھی کہ وہ شابو کی پنجرے کی مینا کی مدد سے اس آدی باسی طبقے کی خرابیوں کی اصلاح کا کوئی راستہ نکالے۔ منگیتر اقتدار عالم سیاسی آدمی تھا ایسی سرکاری اسکیموں سے واقفیت اور اُن تک پہنچ بھی رکھتا تھا۔ بعض متعلق لوگوں سے اس نے جب اپنا خیال بیان کیا تو انھیں خاصے امکانات نظر آنے لگے۔ بس پھر کیا تھا اقتدار عالم اپنے چند خاص ساتھیوں کے ساتھ اس پروجیکٹ میں جٹ گیا۔ شابو کی سیدھی سادھی پنجرے کی مینا اب مینا جوگن بن گئی۔ آدی واسی اپنی کونسی حاجتیں اور مرادیں لے کر آئیں گے اور کیا سوال کریں گے ماہرین نے اس کی کھوج کی اور بی جمالو نے مینا جوگن کو اس کے جوابات رٹانے کی مشق کرائی۔ مہرن یہ سب دیکھ رہی تھی، اقتدار عالم نے جب کچھ لوگوں کی ایک مشاورتی کمیٹی بنائی جس کا مشورہ تھا کہ اس کام میں تھوڑا بہت گلیمر ڈالنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ بھولا بھالا آدی واسی دیکھ کر بھونچکا رہ جائے۔ مہرن نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اسکیم کا مطلب پیسہ کمانا نہیں ہونا چاہئے لیکن کسی نے نہیں سنا۔ سوال کرنے سے پہلے مینا کو ایک گانے کی دُھن سنائی جاتی۔ اس گانے کی دُھن پر مینا کو جواب رٹائے گئے تھے۔

موسیقی کے ماہر نے سوالی کے سوال پر نظر کی اس کے مطابق گانے کا انتخاب کیا۔ گانا بجنا شروع ہوا۔

آوارہ ہوں۔ یا گردش میں ہوں آسمان کا تارا

ہوں۔ آوارہ ہوں۔

جیسے ہی گانا ختم ہوا، آنے والے سے سوال کرنے کو کہا گیا، سوالی نے سوال پوچھا۔

''بینا جوگن میری غریبی کب دور ہوگی'' بینا نے جواب دیا۔

''غریبی دور کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں میں چاہتا ہوں'' آدمی گڑگڑایا۔ جواب ملا۔

''دارو چھوڑ دو۔ غریب نہیں رہوگے''

اگر کسی کو اس طرح کی بات پوچھنا ہوتی کہ وہ فلاں جگہ لڑکی کا رشتہ کرے یا نہ کرے تو بینا کو یہ گانا سنایا جاتا

''انکھیاں ملا کے۔ جیا بھرما کے چلے نہیں جانا۔ او ہو چلے نہیں جانا''۔ گانا سن کر بینا فوراً سوال کرتی۔

''قرض دار ہو؟''

''ہاں بیس ہزار کا'' آدمی منہ لٹکا کر جواب دیتا۔

''اُدھاری ادا کرو، شادی بعد میں'' بینا کی نصیحت سن کر آدمی واسی حیران رہ جاتا۔ دل پر اثر بھی کچھ زیادہ ہوتا۔ اگر چہ اس کام میں طوطے والی آمدنی تو نہ تھی مگر پھر بھی شابو کے دروازے پر بھیڑ رہنے لگی۔ اچھے سوالوں پر انعام دیئے جانے لگے اور یہ دکھائی دینے لگا کہ پروجیکٹ شہرت حاصل کرے گا۔

پھر جب اسمٰعیل خٹک کو معلوم ہوا کہ اس کا ہونے والا ایم ایل اے داماد بینا جوگن کے آشرم کی چپکے چپکے ترقی کے لئے لگا ہوا ہے تو وہ آگ بگولہ ہوگیا۔ شام کو جب وہ اپنی منگیتر سے ملنے آیا تو اسمٰعیل سگار جلائے بیٹھا تھا۔ اُسی وقت اقتدار عالم اور اپنی بیٹی کو ساتھ لیا اور اندر کی جانب ایک نوتعمیر کمرے میں لے گیا اور بولا ''تم دونوں اس بات کو سمجھ لو کہ ہمارا کاروبار کس قدر سائنسی بنیادوں پر چل رہا ہے، یہ کہہ کر اس نے دیواروں پر ٹنگے طوطوں کے بدن کے رگ و پٹھے اور اعضاء کے نقشے جو بھاری تعداد میں ٹنگے ہوئے تھے دکھائے۔ پھر اس نے بتایا کہ تقریباً ۱۰۰ کے قریب ماہرین اس پروجیکٹ میں لگے ہیں، طوطے بابا کو پانچ ہزار کا ایک انجکشن ہر ہفتے لگتا ہے۔ طوطے کے اندر یادداشت ذہانت اور سمجھداری کو اپنی ضرورت کے مطابق قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ جو لوگ اس کام میں سرمایہ لگا رہے ہیں وہ زیادہ تر دوسرے کاروباروں میں ہارے ہوئے لوگ ہیں، یہ دیکھ کر کہ تمہارا کوئی عمل ان کے پیٹ پر لات مار رہا ہے تو تم راستے سے ہٹا دیئے جاؤگے۔ طوطے بابا سے عقیدت کی حالت یہ ہے کہ طوطے بابا پر قیمتی چڑھاوے چڑھ رہے ہیں، انھیں کہاں رکھا جائے سمجھ میں نہیں آتا۔ بیرونی ممالک سے آنے والے طوطے بابا کے بھگتوں کے ٹھہرنے اور کھانے کا انتظام ہم نہیں کر پا رہے ہیں۔ اگر تم یہ بزنس کرنا چاہو گے تو گھر کے آدمی ہو، ہم تم کو اجازت دے سکتے ہیں اور جو مدد چاہو وہ بھی، چار پیسے تم بھی کمالوگے۔ لیکن اس کا منگیتر اقتدار عالم کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا، خفگی سے بولا۔

''دن بھر رسوئی گھر میں مرو، تب چالیس ہزار مہینہ کماؤ۔ ملائی کوئی اور کھائے تم تل چھٹ کھاؤ۔ مجھے نہیں چلانا ہے ڈھابا''۔

جب بینا جوگن کا باقاعدہ آشرم کا افتتاح ہوا تو پولیس بینڈ بجا، آتش بازی چھڑائی گئی۔ اخباروں میں پورے صفحے کے اشتہار چھپے، پریس کے نمائندوں کو ہوٹل میں دارو کے بعد ڈنر دیا گیا۔ پریس نوٹ میں پورے کام کو سیاسی اور اصلاحی رنگ دیا گیا تھا اور یہ مقصد بیان کیا گیا تھا کہ بینا جوگن کی مدد سے آدی واسیوں کے پچھڑے پن کی اصلاح کے لئے کچھ نئی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ادارے کا کچھ کمانے کا منشاء نہیں ہے بلکہ معقول آمدنی ہونے پر اسے آدی واسیوں کی اصلاح پر ہی خرچ کیا جائے گا، ادارے کا اعزازی پیٹرن آدی واسی منترالئے کی وزیر ریاست کو بنانے کی تجویز بھی سب سے اوپر تھی۔

طوطے بابا کے کارکنوں کی صفوں میں اس افتتاح سے ہڑکمپ مچ گیا، اسمٰعیل خٹک کو فوراً ہنگامی میٹنگ بلانی پڑی۔ اس میٹنگ میں اقتدار عالم کے چھوڑے ہوئے جاسوس بھی موجود تھے انھوں نے آکر خبر دی کہ ہر ممبر کو بینا جوگن کے فراڈ کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے، بحث میں کہا گیا کہ یہ دعویٰ بالکل جھوٹا ہے کہ آدی واسیوں کی اصلاح کے لئے یہ گل کھلایا گیا ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اس پورے سیاسی کھیل کے پیچھے اسمٰعیل خٹک کے ہونے والے داماد اقتدار عالم کھلے خزانے موجود ہیں۔

ایک ممبر جن کا چہرہ رعب دار تھا، چوڑی چھاتی اور بھاری مونچھیں تھیں اور اسمٰعیل خٹک کی داہنی بھاری بھرکم کرسی پر بیٹھے تھے اور گلے میں ریوالور کی پٹی مع گولیوں کے پڑی تھی، دونوں آنکھیں بند کر کے جملہ بولتے تھے پھر آنکھیں کھولتے تھے، انھوں نے پہلے آنکھیں بند کیں اور پھر بولنا شروع کیا۔

اسمٰعیل اب تک یہ بات سمجھ گئے ہونگے کہ ہمارے کاروبار میں، ہمارے اپنے کی پہچان کیا ہے؟ اگر نہیں سمجھے ہیں تو ایک بار پھر سمجھ لیں'' یہ کہہ کر انھوں نے بند آنکھیں کھولیں، اِدھر اُدھر دیکھا پھر آنکھیں بند کیں اور بولے ''ہمارا داماد یا ہمارا بیٹا یا بیٹی ہمارے اپنے نہیں ہیں، ہمارا تو وہ ہے جو اپنی پہچان الگ نہ رکھے بلکہ جس طرح ہم اسے پہچاننا چاہتے ہیں اس طرح وہ خود کو ہمیں پہچنوائے۔ ہمارا تو صرف وہی ہے جو ہمارے انگوٹھے کے نیچے رہے، جو ایسا نہیں کرسکتا ہے وہ ٹریگر پر رکھی ہوئی ہماری انگلی کے نیچے دب سکتا ہے''۔ پھر اس نے اطمینان سے آنکھیں کھولیں، اسمٰعیل کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر کے کہا۔

''اپنی بیٹی اور اس کے بوائے فرینڈ کو میرے پاس بھیج دو لیکن ایک ساتھ نہیں الگ الگ''۔ لگتا تھا طوطا بابا آشرم کا ڈائرکٹر وہی تھا۔

میٹنگ ختم ہوئی تو بستر پر آنے کے بعد اسمٰعیل کو نیند نہیں آئی۔ سویرے بیوی کو منہ دھونے سے پہلے سختی سے ہدایت کی کہ وہ بیٹی کو اپنے مائکے بھیج دے اور اقتدار عالم اس وقت تک یہاں نہیں آئے جب تک وہ اجازت نہ دے۔

اقتدار عالم اور مہرن کو بھاری مونچھوں والے سے ملنے کے لئے بلایا گیا، مگر انھوں نے ملنے سے انکار کردیا۔

مہرن کو نانی کے گھر پہنچ کر سب سے بڑا غم اور غصہ اس بات پر تھا کہ اقتدار عالم اس سے ملنے نہیں آیا۔ وہ اقتدار سے محبت کرتی تھی اور اسے کافی ہاؤس کی ملاقاتوں میں سب کچھ بتا چکی تھی کہ وہ کیا ہے۔ اس نے اقتدار کو فون کیا لیکن شکایت سے پہلے اقتدار نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ مینا جوگن کے پروجیکٹ میں وہ بہت مصروف ہوگیا تھا۔ اسے پنجرے کی مینا کو منڈی میں اتارنے کے لئے کارپوریٹ فکر میں ڈھلی ہوئی ایک خوبصورت پیشہ ور عورت کی ضرورت تھی جو اسے مل گئی ہے۔ مہرن کو اپنے باپ پر جس نے مہرن کو گھر سے ہٹا دیا تھا حیرت نہ تھی کیونکہ وہ اپنی ماں کو اکثر باپ سے یہ کہہ کر لڑتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔

''طوطا اتنا طاقتور ہوگیا کہ اس کے خوف کے علاوہ کسی کا خوف تمہارے دل میں نہیں رہ گیا۔ پرانی داستانوں کی طرح تمہاری جان اب طوطے کے اندر ہے''۔

کچھ دن خاموشی سے گزر جانے کے بعد کا یہ واقعہ ہے جس کی رپورٹ کہیں نہیں کی گئی۔

رات کے ایک بجے کا عمل رہا ہوگا۔

اقتدار عالم ٹیکسی سے اتر کر ایک نیم روشن گلی میں پیدل داخل ہوا۔ دو لمحوں بعد یکا یک اس کے دائیں اور بائیں دو لمبے تڑنگے مرد اس کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ اقتدار عالم اُن دونوں کے بیچ میں چل رہا تھا یکا یک اقتدار عالم کے داہنے کندھے کی طرف چلنے والا بائیں طرف کے کندھے پر چلنے والے سے بولا۔

''ہمارا وہ ہے جو اپنی شناخت نہ رکھے''

بائیں طرف کے کندھے پر چلنے والے نے فوراً جواب دیا۔

''ہمارا صرف وہ ہے جو صرف ہمارے انگوٹھے کے نیچے رہے''۔

پھر دائیں طرف کے کندھے والے نے بائیں طرف والے کو مخاطب کیا۔

''جو انگوٹھے کے نیچے نہیں رہتا ہم اس کے لئے ٹریگر پر رکھی انگلی دباتے ہیں'' اقتدار عالم بھونچکا کبھی داہنے اور کبھی بائیں دیکھتا لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی اس سے مخاطب ہی نہ تھا وہ تو آپس میں باتیں کررہے تھے آخر وہ لمبے تڑنگے آدمی یکا یک واپس لوٹ گئے۔ اقتدار عالم کو رات کے سناٹے میں یوں خوفزدہ اور حراساں کرنے والی واردات کی رپورٹ کہیں نہیں لکھوائی گئی۔ اس طرح کا سانحہ چند نوں میں ایک بار نہیں بلکہ کئی بار دہرایا گیا۔ آخری بار اس جملے پر کچھ زیادہ ہی زور دیا گیا۔

''جو ہمارے انگوٹھے کے نیچے نہیں رہتا ہم اس کے لئے بس ٹریگر پر رکھی انگلی دبا دیا کرتے ہیں''

الیکشن اب بہت قریب تھا، اس میں بھی شک نہ تھا کہ اقتدار عالم کی پارٹی کنگ میکر کی حیثیت اختیار کرچکی تھی ۔ نئے حالات کو دیکھتے ہوئے برسراقتدار پارٹی خود کے تحفظ کے لئے بڑی خاموشی سے نئے عہد و پیمان اور نئی وفاداریاں قائم کررہی تھی مگر اخبارات کی انکلوں کے باوجود وہ گہرا راز بنتی جارہی تھیں۔

مہرن پہروں سوچنے پر بھی نہیں سمجھ پارہی تھی کہ وہ کونسی طاقت تھی جس نے طوطے جیسی Love Bird کو بوٹیاں نوچنے والے خونخوار گدھ میں تبدیل کردیا ہے تو کیا شابو کے چھوٹے سے پنجرے والی صابر اور شاکر مینا کے ساتھ بھی یہی ہونے جارہا ہے۔

پورا ایک پاور اسٹرکچر کھڑا ہوگا ۔ یعنی دغا فریب، منافقت، مارکاٹ جنگ و جدال پھر مہرن کو لگا جیسے اقتدار عالم کی خون میں لت پت لاش بیچ سڑک پر پڑی ہے۔ اُس نے خوفزدہ آواز میں اپنے منگیتر کو مینا آشرم سے سبکدوش ہوجانے کا مشورہ دیا تو اقتدار عالم چہک کر بولا۔

''خاموش بیٹھی رہو۔ جلد ہی تم ایک اچھی خبر سنوگی''

''کیسی خبر؟''

''گھنی مونچھوں والے سے ہماری کولڈ وار کے سلسلے میں''۔

دوسری طرف منڈی میں پلی اور کارپوریٹ فکر میں ڈھلی اُس گڑیا کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہ تھا اس کو تو اقتدار نے کرائے پر حاصل کیا تھا، اس نے اپنے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں ایسی جگہ۔ جہاں داخل ہوتے ہی سب کی نظر پڑے شیشے کے آبنوسی فریم میں یہ عبارت لگا رکھی تھی۔

میں معاشی اور نظریاتی طور پر اس کی وفادار ہوں جو میری دانشوری کو کام میں لاتا ہے اور اس کی مجھے اجرت دیتا ہے۔

کچھ ہی دنوں میں اسمٰعیل کے پاس ناچتی گاتی یہ خبر پہنچ گئی کہ کسی نائٹ سروس بینک کے سنسان سے کاری ڈور میں ایک رات دو زخموں نے جن کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی گھنی مونچھوں اور بھاری آواز والے بینک کے ایک گاہک کو گھیر لیا۔ وہ ریوالور والے کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر دائیں بائیں چلنے لگے اور اس کے کانوں میں اپنی باتیں اسے مخاطب کئے بغیر ڈالنے لگے۔ پہلا بولا۔

دیکھو میری جان سیاست میں ایک دشمن ہمیشہ پال کر رکھنا چاہئے'' دوسرا زنخا جواب میں۔

''اس لئے کہ دشمن آپ کو چوکنا رکھتا ہے''۔

''بالکل ٹھیک'' پہلے والا زنخا فوراً بولا۔ ''لیکن سیاست میں آج جو آپ کا دشمن ہے کل دوست بھی

ہوسکتا ہے'' دوسرا زنخا ہنسا اور جواب دیا۔

'' کیونکہ طوطے کے خزانے سے اس نے جو غیر قانونی کمپنیوں کا جال بچھا رکھا ہے اور جو سرکاری لائسنسوں کے بغیر مالی اسکیمیں چل رہی ہیں ان کا کیا ہوگا''۔ دوسرے نے فوراً بات ماری۔

''پھر تو انفورسمنٹ ڈائرکٹریٹ دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے گا یا پھر بدنامی کے ڈر سے تم اپنے ہی ریوالور سے اپنے سر میں گولی مارلوگے۔'' ابھی تک دونوں زنخے آپس میں ہی باتیں کررہے تھے اور ریوالور والے کو دیکھ بھی نہیں رہے تھے لیکن اب زنخے نمبر ایک نے اشارے سے گھنی مونچھوں اور ریوالور والے کو روکا، اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر فحش انداز کی بازارو لٹک مٹک کے ساتھ بولا۔

''اب جانی آخری بات۔ جلدی فیصلہ کرو کہ تم کو مینا جوگن سے لڑنا ہے یا صلح کرنا ہے؟'' گھنی مونچھوں والا غصّے سے ابل رہا تھا اس نے زنخے کی کلائی پکڑ لی۔ زنخا چلایا۔

''اوئی میں مری۔ مردوا میری عزت لوٹ رہا ہے''۔ لوگ ادھر مخاطب ہوں اس سے پہلے کلائی چھوڑ دی گئی تھی اور دونوں زنخے منظر سے باہر ہو چکے تھے۔

یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ راہ چلتے سڑک پر دو زنخے گھنی مونچھوں والے کو اتنا سب کچھ کہہ جائیں اور اس کے جوائنٹ ڈائرکٹر یعنی داہنے ہاتھ اسمٰعیل کو خبر نہ کی جائے جبکہ اُس رواں دواں دولت اور طاقت کا سرچشمہ اسمٰعیل خٹک ہی تو تھے۔

یہ میٹنگ اسمٰعیل خٹک کے خاص پرائیویٹ کمرے میں پوری رازداری کے ساتھ کسی کے علم میں لائے بغیر ہوئی۔ اسمٰعیل خٹک اُس ایک واقعے کی تفصیل پر گہری نظر رکھ کر اپنے بھاری مونچھوں والے ساتھی کو یاد دلا رہا تھا۔

''یہ اُس حادثے کا جواب ہے جس میں دو زور پشت آدمی اقتدار عالم کو دائیں بائیں گھیر کر اسے خوفزدہ کردینے والی باتیں سنا کر گئے تھے''۔ بھاری مونچھوں والے نے اقرار میں گردن ہلائی، ''وہ تو ہم نے ہی بھیجے تھے'' اسمٰعیل تیوریوں پر بل ڈال کر غصّے سے بولا '' مجھے افسوس ہے کہ اس سانحے کے پیچھے میرے ہونے والے داماد کا ہاتھ ہے''۔ بھاری مونچھوں والا یہ سن کر دبی مسکراہٹ مسکرایا اور بولا۔

''صرف ہونے والا داماد ہی نہیں، اگر تمہاری بیوی بھی اس میں شامل ہوتی تو بھی یہ تعجب کی بات نہ ہوتی۔ میں تمہارے پاس یہ شکایت لے کر ہرگز نہیں آیا ہوں۔ ہم جو کام کررہے ہیں، یعنی دولت اور طاقت کا جو کھیل کھیل رہے ہیں اُس میں رشتوں کی حقیقت تاش کے پتوں کے محل سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتی، یہ بات میں بھی اچھی طرح سے جانتا ہوں اور تم بھی'' اسمٰعیل نے بھاری مونچھوں والے کی بات کی تائید کی تو بھاری مونچھوں والے نے آنکھیں بند کیں اور بڑی کمزور آواز میں بڑبڑایا۔

'' سیدھی بات یہ ہے کہ یہ سانحہ اور سڑک پر گستاخانہ طور پر زنخوں اور زنانوں کے ہاتھوں ہمیں دہشت زدہ کرنے کا یہ عمل صاف بتا رہا ہے کہ Power Shift ہوئی ہے۔

کچھ دنوں سے مہرن کو لگ رہا تھا کہ گھریلو تلخیوں سے پیدا ہونے والے اس کی ماں کے آنکھ کے کچھ آنسو خود مہرن کی آنکھوں میں بھی تیرنے لگے ہیں۔ وہ بار بار سوچتی آخر وہ کیا چیز ہے جو اس کے منگیتر سے اسے خاموشی کے ساتھ خوفزدہ کرنے لگی ہے۔

مہرن کو لگا کہ اقتدار کے نزدیک خوبصورتی اور علم کے معنی وہ نہیں جو مہرن کی نظروں میں ہیں۔ وہ اس علم کو علم نہیں مانتی تھی جس سے بصیرت حاصل نہ ہو۔ یہ اس روز کی بات ہے جب وہ کافی ہاؤس میں اقتدار کے ساتھ بیٹھی تھی اور ساتھ میں کارپوریٹ فکر میں ڈھلی وہ جاپانی گڑیا بھی تھی۔ جو فوراً بول پڑی تھی۔ ''یہ بصیرت کیا چیز ہوتی ہے۔ ہماری دانشوری بت شکنی کے چکر میں نہیں پڑتی۔ ہماری دانشوری تو اُدھر جھکتی ہے جدھر طاقت اور اتھاریٹی ہوتی ہے۔ جب تک اقتدار صاحب کے پاس طاقت اور اختیار ہے ہم ان سے بے وفائی نہیں کرسکتے۔ مہرن غصّے میں اُٹھ کر چلی آئی، اقتدار نے اسے روکا بھی نہیں۔

اس دن مہرن نے جب باپ کی دراز کھولی تو ریوالور کی کچھ گولیاں رکھی ہوئی دیکھیں تو غصّے سے تمتماتے ہوئے گالوں کے ساتھ سوچتی رہی، کہ ان میں سے کس گولی پر اُس بازارو گڑیا کے پیچھے اقتدار عالم کا نام لکھا ہوا ہے۔

انھیں دنوں مہرن کو معلوم ہوا کہ طوطا آشرم کا طاقت ور بھاری مونچھوں والا اقتدار کو اپنی کمپنی کا اعزازی ممبر بنا کر دوستی کا ہاتھ بڑھانے جارہا ہے، مہرن نے فون پر اقتدار سے اس کی تصدیق چاہی تو اس نے جواب دیا۔

''ہمارا کام پیسہ کمانا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی ضد بن کر نہیں رہ سکتے''۔

''پھر انھوں نے ہماری توہین کیوں کی؟ مہرن چیخی'' مجھے میرے گھر سے نکلوا دیا''

''تب انھیں ایسا لگا تھا کہ ہم ان سے کمتر ہیں۔ اب انھیں معلوم ہوگیا ہے کہ ہمارے بھی طوطے ہیں، اچھا پھر بات کرونگا ابھی جلدی میں ہوں'' فون کاٹ دیا گیا اور مہرن اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔

اقتدار عالم اب بہت کم مہرن سے مل پاتا تھا۔ ایک معمولی مینا کے وسیلے سے عام لوگوں میں اس کی شہرت آدی واسیوں کے مسیحا کی بنتی جارہی تھی اور وہ اپنی پارٹی میں روز بروز باعزت سے باعزت مقامات حاصل کررہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مینا کی مالکن شتابو کو اس جاپانی گڑیا کے ساتھ کبھی کبھی اونچے سیاسی گلیاروں میں گھومتا ہوا پایا جارہا تھا۔ شتابو نے مینا کو پوری ایک جوگن کا روپ دے دیا تھا، اسے مقامی آدی واسیوں کی زبان سکھانے میں بڑی محنت سے اپنے وسائل

استعمال کئے تھے۔ جاپانی گڑیا نے مینا جوگن کی بھیلوں کی بستی میں اخبار والوں کو ساتھ لے جا کر کچھ شو کئے تھے اور اقتدار عالم کے ساتھ سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری تھی۔ مہرن کے شب و روز میں اس کے منگیتر کا رول تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ مینا جوگن کی انتظامیہ کمیٹی میں اس کے باپ کے حلیف گھنی مونچھوں والے کو اس کے منگیتر کے ذریعے شامل کئے جانے کی خبر خاصی گرم تھی۔ مہرن نے بہت کوشش کی کہ فون پر اقتدار عالم سے رابطہ قائم ہوجائے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

وہ غصّے کی حالت میں اقتدار کے دفتر پہنچ گئی جہاں دوسرے دن مینا جوگن دھام کی انتظامیہ کمیٹی کی میٹنگ ہونے والی تھی، اس نے دیکھا ڈائس کے سامنے مینا جوگن دھام کے سینئر ممبر بیٹھے ہیں اور جاپانی گڑیا کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے جسے دکھا کر وہ کہہ رہی ہے ''یہ ہوشیار سنگھ بھگت کی انگریزی ناول ہے، تین مہینے میں اس سڑی ناول کی ۵ لاکھ کاپیوں کو پبلسٹی اور مارکٹنگ کے دم پر بکوا دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ پھر اس جاپانی گڑیا نے ایک سیانی لڑکی کو اپنے پاس بلا کر کھڑا کیا وہ شابو کی لڑکی تھی، میز پر سے لکڑی کا پوائنٹر (Pointer) اُٹھایا اور اس کی نوک لڑکی کے ایک پستان پر رکھ کر بولی۔

''یہ جیسے آپ کو نظر آرہے ہیں ویسے ہیں نہیں۔ بلکہ جیسے بازار چاہتا ہے ویسے ہیں۔ اس طرح اس لڑکی کی آنکھوں کی پتلیوں کے رنگ موسم اور محفلوں کے مزاج کے مطابق لینس کے ذریعے بدلتے رہتے ہیں۔ (ہونٹوں پر پوائنٹر رکھ کر) نو طریقوں سے ہم نے اسے مسکرانا سکھایا ہے۔ مارکٹنگ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ جب چاروں طرف سے آپ گھیرے میں لے لئے جائیں اور پھر وہ اتنا تنگ ہوجائے کہ آپ کو لگے کہ آپ کی بوٹیاں نُچ رہی ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ آپ کہاں کھڑے ہیں'' شابو کی لڑکی کی معصومیت یوں چھنتے دیکھ کر مہرن سے برداشت نہ ہوا۔ وہ غصے سے پیر پٹک کر وہاں سے چلی آئی۔ باہر آئی تو اس نے دیکھا مینا کی کچھ تصویروں کے قدآدم Blow ups دفتر کی باہری دیوار پر لگائے جارہے تھے۔ مینا واقعی بڑی پُرکشش جوگن نظر آرہی تھی۔ ایک تصویر کے نیچے لکھا

تحلیل ہوئے بن کے دھواں، شہر میں ایسے
ہم پھر نہ گئے گاؤں، کبھی گھر نہیں دیکھا

معروف ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی **فضیل جعفری** بھی نہیں رہے۔
ان کا شمار اردو کے نمائندہ دانشوروں میں ہوتا تھا۔ ان کی غیر ادبی تحریریں بھی ادبی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں۔
ادارہ 'نیا دور' جلد ہی فضیل جعفری کی **ادبی خدمات** پر ایک شمارہ معنون کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس میں **اسرار گاندھی**، **علی احمد فاطمی** وغیرہ کے مضامین شامل رہیں گے

تھا ''محبت کرنے والی چڑیا''۔

مہرن نے اس کے نیچے غصّے میں لکھا ''اور تم؟'' پھر ایک بڑا سا سوالیہ نشان لگا کر چلی گئی۔

ساری رات وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی، اس کا باپ تو پہلے ہی اُس سے چھن چکا تھا، اب اس کا منگیتر بھی اس کا نہ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کو اپنے شوہر کے انتظار میں رات رات بھر روتے دیکھ چکی تھی، اسے لگا کہ وہ جس بازار میں بک سکتی تھی وہ بازار اُجڑ چکا ہے۔ اس نے طے کیا کہ وہ کسی کو اقتدار عالم کا شکار نہیں بننے دے گی۔ دوسرے دن وہ اقتدار عالم کی میٹنگ میں جہاں بھاری مونچھوں والے کو ممبر بنایا جانے والا تھا، خاص تیاری کے ساتھ گئی، اس نے دیکھا اقتدار کا چہرہ شراب کے اثر سے تمتما رہا تھا۔ مہرن نے اپنے دونوں ہاتھ اقتدار کے کندھوں پر رکھے اور اس کے کان میں دھیرے سے بولی۔

''ہم کوئی کام ایسا نہیں کر رہے جو کتابوں میں لکھا جائے گا، یہ اخباروں میں رہ جانے والے کام ہیں۔ پھر اس نے اپنے لباس کے اندر چھپے ریوالور کے لوہے کو محسوس کر کے دیکھا اور اطمینان سے ریوالور نکال لیا لیکن جب اس کی نال اقتدار کی گردن کی طرف گھمائی تو کیا دیکھتی ہے کہ اقتدار کی برابر والی کرسی پر ایک دوسرا اقتدار بیٹھا ہے، پھر دیکھتی ہے کہ تیسری اور چوتھی کرسی پر بھی اقتدار ہے، وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی جب اس نے دیکھا کہ ہال کی ہر کرسی پر اقتدار عالم بیٹھا تھا۔ مہرن کو یقین نہیں آیا۔ دیوانوں کی طرح ایک ایک چہرے کے قریب آنکھیں لے جاتی، غور سے دیکھتی مگر وہ اسے اقتدار عالم ہی نظر آتا۔ اتنے ڈھیر سارے اقتدار عالموں کو ایک جگہ دیکھ کر وہ کانپ گئی۔ وہ کس پر گولی چلاتی۔ کچھ دیر تک وہ اس اقتدار عالم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی جس کو وہ گولی مارنا چاہتی تھی مگر اس ناکامی پر آخر کو پورے بدن سے کانپنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہوکر گر پڑتی باپ کی شفقت نے اسے بڑھ کر سنبھال لیا۔ اور تو کچھ کیا ہوتا البتہ دوسرے دن ہاتھ میں ریوالور لئے اسمٰعیل کی بانہوں میں ایک بیہوش لڑکی کی تصویر اخباروں کے پہلے صفحے پر ضرور چھپی تھی۔

□□□

ایک اور برزخی

انیس رفیع
AH141، سیکٹر ۲، سالٹ لیک، کولکاتہ
موبائل: 9432646374

گلی نیم تاریک تھی۔ وہ اس لئے کہ برسوں پہلے راجہ بازار میں واقع گیس سپلائی کمپنی بند ہوگئی تھی۔ پورے شہر میں گیس کی پائپ لائن بچھی ہوئی تھی جن کے ذریعہ شہر کی عمارتوں، ہسپتالوں، ہوٹلوں اور گھریلو کارخانوں میں گیس سپلائی ہوتی۔ گھروں میں یہ رسوئی گیس کی طرح استعمال ہوتی اور شہر کی سڑکوں پر اسٹریٹ لیمپ کو روشن رکھنے کے لئے۔ گیس سپلائی ضروری خدمات کے زمرے میں رکھی گئی تھی کہ اس کے فیل ہونے سے رسوئی میں کھانا بننا بند اور سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹ گل ہو جاتی۔ گلی کوچوں کے نکڑ پر لگی یہ سہ شاخہ گیس لالٹین تو پہلے بند ہوتی۔ گلیاں اندھیروں میں ڈوب جاتیں۔ دراصل اس گلی کا مقدر ہی اندھیرا تھا۔ باہر دن کتنا بھی روشن ہو پر گلی نیم تاریک ہی رہتی تھی۔ بلڈنگوں کے مکین اپنے فلیٹوں میں متبادل انتظام کر لیتے۔

دن کے دس بجنے کے بعد گلی میں سناٹے کا عمل دخل بڑھ جاتا۔ آمد و رفت بس اتنی تھی کہ ویرانی کا احساس نہ ہو۔

اس نیم تاریک گلی کے نکڑ پر ایک قدیم طرز کی حویلی نما عمارت تھی۔ نہ جانے کب سے بالکل ویران خالی پڑی تھی۔ مالکوں نے کوئی چوکیدار یا دربار بھی مقرر نہ کر رکھا تھا۔ کارپوریشن والوں نے کہیں پر بھی دیوار پر Enemy Property کی تختی بھی نہیں لگائی تھی۔ ایسی لاوارث کوٹھی تو شاید کسی نے نہ دیکھی ہو۔ سنا گیا تھا کہ پہلی اور دوسری منزل ملا کر چوبیس کمروں والا مکان تھا۔ کمرے کی دیواریں مخدوش ہو گئی ہوں گی۔ ضرور ہوئی ہونگی۔ مدتوں سے چونا کاری کے بغیر دیواریں کتنا سہن کریں گی۔ بے مرمت گھر کو تو ملبے میں تبدیل ہونا ہی ہے۔ سال دس سال، سو سال۔ تاب ہونی چاہئے سنبھالنے کے لئے۔ تاب تو ہوتی ہے۔ کورناک، جامع مسجد، لال قلعہ، تاج محل۔ پر ان کے پیچھے سرکار ہے۔ سب کی وارث۔ انڈسٹری ہے، ٹورسٹ انڈسٹری۔ منزل شوق۔

اس لاوارث مخدوش کا شوق کسے ہونے لگا جو لے گا زیاں بار ذمہ داریوں سے لد جائے گا۔ ایک خبر یہ ملی تھی کہ ممبئی کا کوئی پارسی تاجر اس میں دلچسپی لے رہا ہے مگر اس کی ملکیت کون دے گا۔ کوئی وارث! مگر وہ ہے کہاں؟ شہر کے نقشے پر پلاٹ نمبر تو ہے مکان اور مالک مکان کا کوئی سراغ اور کوئی اندراج نہیں۔ چوبدیوں پر مالکان کے نام ہیں مگر دس پشتوں قبل کے۔ بیشتر دستاویزات دیمک کے کھائے ہوئے۔ مول کوڑیوں کے ہوں گے۔ بازار نہ تھا۔ دور گلی کے دوسرے نکڑ پر ہاتھ رکشہ بنانے والوں کی چھوٹی سی فیکٹری اور مکان تھا۔ شہر کے مرکز کو جانے والے آنا جانا ادھر ہی سے کرتے۔ شام ہوتے ہی بڑی سڑک سے ملی اس نکڑ پر گیس کی سہ شاخہ بتی روشن ہو جاتی اور گلی نیم تاریک بلکہ اندھیری۔

قصہ دن کا ہی ہے۔ وقت، وقوعہ، اطرافات اور کردار سب دکھیں گے۔ پر دھندلے دھندلے۔ روشنی کم ہو تو اتنے ہی نظر آئیں گے۔ اس پھیکے پن کی وجہ تھی یہ مخدوش اور بے مکیں دو منزلہ عمارت۔ مخالف طرف کی عمارت کی کوئی کھڑکی یا کوئی دروازہ گلی کی طرف نہ کھلتا تھا۔ اس کی دیواروں پر راہگیر اور کنگالی پیشاب کیا کرتے تھے۔ بے روک ٹوک، کوئی ٹکاری بھی نہیں مارتا۔ ایک ازار بند کھولتا، کوئی دھوتی اٹھاتا اور شروع ہو جاتا۔ سڑاس بنی دیوار پر البتہ ایک تختی ضرور لگی تھیCommit No Nuisance (پیشاب کرنا منع ہے۔)

دھیرے دھیرے یہ عمارت آسیب زدہ عمارت مشہور ہوگئی اور ایک حکایت بھی جڑ گئی۔ کبھی کسی جہاز راں کمپنی نے اپنے عملوں کے لئے اسے کرائے پر لے لیا تھا تا کہ وہ عارضی طور پر یہاں قیام کریں اور غیر ملکی جہازوں کی واپسی کے بعد یہ ہاسٹل خالی ہو جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران کسی اطالوی کمپنی کا ایک بڑا جہاز جس کے سیکڑوں عملہ تھے، سمندر سے لگی ندی کے Dock میں لنگر انداز ہوا تھا۔ چونکہ سمندر میں جہازوں کا سفر طویل اور اکتا دینے والا ہوتا ہے اس لئے اس کے افسر عملے اکثر اپنے بیوی بچوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ اس جہاز کے عملے کے لئے یہ پورا ہاسٹل مہمان خانے کی طرح سجایا گیا۔ سیر و تفریح کے پروگرام مرتب کئے گئے۔ جہاز کا کیپٹن بیحد سخت گیر اور ڈسپلن کا بڑا پابند تھا مگر خالی وقت میں ایک خوش مزاج اور جمال پرست فرد تھا۔ اس کا ایسا ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ یہ اس کا پہلا سفر تھا۔

اس کا ایسا ہونا حیرت کی بات تھی۔ اطالوی

زبان کا یہ شاعر پیٹ رارچ کا پرستار تھا جو مکیاویلی کے آمری تصورات کا سخت مخالف تھا۔ فکری آزادی کا نویدی اور غیر ضروری رسمی وتہذیبی دباؤ کا منکر۔ اس کا اطالوی شاعری درجۂ کمال کو پہنچنے کے مرحلے میں تھی۔ وہ سانیٹ نویسی کا دلدادہ تھا، اس کی ایک نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

میرا میں مجھ سے ہی فرار ہونا چاہتا ہے جیسے وہ کوئی دوسرا ہی ہوگیا ہو
کبھی کبھی ننگے پاؤں، ننگے سر اور ننگے بدن میرے چیمبر میں گھس آتا اور پھر
توڑ پھوڑ مچاتا پھر میرے روبرو فرش پر پالتی مار کر بیٹھ جاتا
کبھی اسے میں نے کریم النفس اور فیاض دیکھا تھا
شرمیلا اور نرم خو
مگر اب...
وہ ایک جنگلی وحشی بن چکا تھا
صرف ایک روٹی میرے ہاتھوں سے چھیننے کیلئے
وہ بھول گیا تھا کتنے خطرے ہیں اس کے آگے
مگر وہ تو رکا ہی نہیں
بدلتا جا رہا تھا
بدلتا جا رہا تھا شب و روز کی طرح

اس کا ایسا ہونا حیرت کی بات تھی۔ مسز دائمورے تجربہ کار عورت تھی۔ مگر مس ذکریا کا یہ پہلا سفر تھا۔ ہاسٹل میں بھی عملوں کی تفریح، قیام وطعام کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ ڈنر کے قبل ہاسٹل کے عارضی رقص گھر میں عملے، موسیقی کی دھنوں پر محو رقص و سرود تھے کہ روشنی گل ہوگئی۔ کہرام مچ گیا۔ پولیس کی آمد سے پہلے یہ ہنستا کھیلتا طائفہ تہہ تیغ کر دیا گیا۔ بربریت کے اس تماشے سے سارا اطراف سراسیمہ ہوگیا۔ حلق سوکھ گئے۔ آوازیں گھٹنے لگیں۔ برسوں یہ علاقہ خوف وہراس کے گھیرے میں رہا اور یہ عمارت خونی عمارت کے طور پر مشہور ہوگئی۔ اس میں بھوتوں نے بسیرا کرلیا تھا۔ اب بھی لوگ اس عمارت کو دیکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔

یہ عمارت نہیں بندرگاہوں کے جیالوں کی قبر ہے۔ گلی محلے کے لوگ کبھی کبھی اس سنے ہوئے سانحہ کا ذکر کر بیٹھتے، کیسا طرحدار جوان تھا ولکوکس، کیپٹن کی وردی میں خوب جمتا تھا۔ ذکریا مارلن منرو اور مسز ڈیمورے ایلزابیتھ ٹیلر۔ سب تہہ تیغ ہوئے۔ بچے والے بھی نہیں بچے۔ بس خدا اوپر تنہا بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ زمین لہو رنگ تھی۔ آواز پاٹ دار تھی۔ کمانڈ بھی دیتا تو گلے کی رگیں تن جاتیں۔

وہ رہنے والا فلورنس کا تھا جیسا کہ معلوم ہوا۔ بچپن وہیں گزرا تھا۔ پلے اسکول، کنڑگائن Standard وغیرہ اس نے وہیں سے کیا تھا۔ اونچی پڑھائی کے لئے اسے روم بھیجا گیا گرچہ اسکول اور کالج کے نچلے درجات میں بہت ہونہار اور ذہین نہیں تھا مگر فیزیکل کاؤٹ ٹریننگ میں کوئی اس کے آس پاس بھی نہیں تھا۔ پرنسپل اور اساتذہ اس سے زیادہ خوش نہ تھے۔ کالج میں طلباء کے لئے آنے والے اچھے موقع اس کے نام کبھی نہ کئے جاتے۔ وہ اپنی شرارتی اور مہماتی اعمال کے لئے خاصی شہرت رکھتا تھا۔ مگر اس نے کالج یا اسکول آتھارٹی کو کبھی ایسا موقع ہاتھ نہ آنے دیا کہ اسے وہاں سے نکال دیا جائے۔

کالج کے دنوں میں ولکوکس کے معاملات اور معمولات جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ بیان کنندہ کی آواز پھر تھرانے لگی تھی۔ چند ساعتوں کے لئے وہ گہری خاموشی میں ڈوب گیا جیسے نرخرے میں یکا یک کوئی شئے اٹک گئی ہو۔ اس نے کوشش کی، خاموشی ٹوٹی اور گفتگو جاری ہوئی۔

جیسا کہ میں نے کہا کالج کے پرنسپل اور وہاں کے ارباب اختیار اسے کوئی سنہرا موقع نہیں دینا چاہتے تھے مگر جب نیوی ریکروٹمنٹ بورڈ نے اسے نیول افسر کے عہدے کے لئے منتخب کیا تو ارباب اختیار نے جانا کہ ہر ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات نہیں ہوتے۔ پھر بھی وہ داؤ کھیلنے کے آرزومند تھے مگر پرنسپل نے ان سے معذرت چاہ لی اور ولکوکس کو اچھے چال چلن کی سند دے دی۔ کتنی کم عمری میں اتنے بڑے جہاز کا کیپٹن بن گیا۔ سب حیرت زدہ تھے۔ ذکریا کم عمر تھی مگر ولکوکس کی چاہت میں ڈوبی جارہی تھی۔ کچھ چاہت کچھ ضرورت دونوں مل کر اسے ڈیک پر لے آئی تھی۔ مسز دائمورے نہ صرف اس سے شفقت کرتی بلکہ نگرانی بھی رکھتی۔ دونوں ایک ہی کیبن میں دراز ہوتیں۔ کیپٹن کو جب کبھی سیل بلا کا احساس ہوتا فوراً کیبن کو الرٹ کرتا پھر دیگر کریو ممبرز کو۔ مگر اس عمارت میں وہ سیل بلا آئی کہ آنکھیں خون سے تر ہوگئیں۔ کس نے کھیلی یہ ہولی اور کیوں؟ کہیں کوئی... پر کیا؟ ایک بھید اور بس۔

کتنے دن بیت گئے۔ عمارت کھنڈر میں تبدیل ہونے کو ہے۔ بیچ شہر کی کوٹھی۔ لاوارث، قیمتی اثاثہ کوڑی کے مول بھی نہ بکے! کارپوریشن کو فکر لاحق ہوئی۔ نکڑ کی صفائی کرائی گئی۔ دیوار پر Commit No Nuisane کی تختی بھی لگوا دی۔ نیم تاریک گلی کا سناٹا کچھ اور بڑھ گیا۔ لوگ حسب معمول اسی تختی کے نیچے یا اسی پر پیشاب کرتے۔ بدبو کا بھبھکا اٹھتا، لوگ ناک دبا کر نکل جاتے۔ کارپوریشن والے اس بدعت سے پریشان تھے۔ انہیں خیال آیا کیوں نہ اس کھنڈر کو نیلا کر دیا جائے۔ شاید کوئی نیا مکین ایسا آئے جو بھوت پریت کو رگید کر باہر کردے۔ سناٹے اور نیم تاریکی کو دور کردے۔

ایسا ہی ہوا! نیا مکین آیا۔ بال بچے بھی آگئے۔ کوئی جوان کوئی نیم جوان، دونوں بھائیوں کی چار لڑکیاں تھیں۔ چاروں کی چاروں بہادر اور اسمارٹ۔ لڑکے ذرا چھوٹے تھے۔ جب کوئی فارغ ہونے کے لئے بیٹھتا یا کھڑا ہوتا پانی کی بھری بالٹی پہلی منزل کے ورانڈے سے پھینکتی اور غائب ہو جاتیں۔ بیچارہ گنہگار شخص۔ پانی میں شرابور لت پت بھاگتا۔ چاروں ورانڈے سے اندر ہال میں بھاگ کر خوب قہقہہ لگاتیں۔ اس تدارکی کارروائی سے کچھ کمی تو آئی مگر وہ لوگ جو پہلی بار اس کوچے میں آتے وہ

شرابور ہوتے اور دیوار سے لگی تختی کو پڑھ کر تیز قدموں سے نکڑ کی داہنی طرف جا کر گم ہو جاتے۔

ایک صبح لڑکیوں نے ننھے بچوں کے شور و غل سنے۔ ’ننگا مانگے پانی، یاد کرو اب نانی‘ ننگا گھبرایا ہوا تھا پر اسے زور کی لگی تھی۔ تختی کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھا، بچے دور جا چکے تھے۔ اطمینان سے بیٹھ کر دیوار پر چھڑکاؤ کرنے لگا۔ اس کی دھاریں سر کے اوپر چپکی تختی تک پہنچتی۔ دھل کر تختی کچھ اور چمکتی اور وہ کھڑا ہو کر کہتا، فتح، فتح، قہقہہ لگاتا اور دوڑتا ہوا تاریک گلی کے دوسرے چھور کی طرف بھاگتے بھاگتے تحلیل ہو جاتا۔ اس گلی میں روز یہ عجیب و غریب واقعہ رونما ہوتا تھا۔ وہ ننگ دھڑنگ روز آتا اور اپنا پسندیدہ عمل دہراتے۔ وہ ورانڈے میں روڑے بھی پھینکنے لگا تھا۔ جن سے لڑکیوں کے مجروح ہونے کا خطرہ تھا۔ ان لوگوں نے اس ورانڈے پر آنا جانا چھوڑ دیا۔ سڑانڈھ پھیلتی جا رہی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا، اس نے پردہ کر لیا۔ مگر محلے والے دھیرے دھیرے اس بڑے Nuisance سے گھبرانے لگے تھے۔ اس تختی کے نیچے تو سبھی فارغ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم میں سے بھی کوئی۔ اس عمارت میں آنے والی نئی فیملی کی بچیاں۔ اس ننگ دھڑنگ لمبو کے ڈر سے ورانڈے کو ترک ہی کر دیا۔ ان کے ساتھ تو بڑا سانحہ ہوا۔ اس گھر کے بزرگ تو ارشد پن ہیں۔ مرشد کی خدمت میں غرق۔ بیٹے سب دکان یا دفتر کی طرف بھاگتے ہوئے۔ گھر خرید کر لافکرے ہو گئے تھے۔

کچھ لوگوں کا قیاس تھا کہ یہ شخص ننگے ناگا سادھوؤں کے گروہ کا تھا۔ کبھی بھٹک کر شہر کی اور چلا آیا اور دیوانہ ہو گیا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ہم سب اسے پکڑ کر سب سے پہلے کپڑے پہنا دیں۔ اس کی ستر پوشی بہت ضروری ہے لہٰذا اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے ایک درزی کو بلایا گیا جو محلے کا ہی تھا اور اس قصے سے پریشان بھی۔ کہا گیا کہ وہ اندازاً اس کی ناپ کے کپڑے سل دے۔ جب وہ فارغ ہو کر پلٹا تو اس کے ہاتھ میں استنجے کا ڈھیلا تھا۔ نشانہ سادھ کر درزی کی پیشانی پر مارا۔ آنکھ بچ گئی مگر پیشانی لہولہان تھی۔ ننگے کی جارجیت کو دیکھ کر وہاں سے لوگوں نے ہٹ جانے میں عافیت سمجھی مگر وہ متفقہ طور پر یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اسے کپڑے ضرور پہنائے جائیں گے۔ درزی سے گزارش کی گئی کہ اس کے ایکسٹرا لارج قمیص اور پتلون سی دے۔ درزی نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کر دیا۔ اب مسئلہ تھا اس دیوانے کو جامۂ تہذیب پہنانے کا۔

ننگ دھڑنگ شخص ہلکے ہلکے قدم سے تختی کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے ہی فارغ ہونے کے لئے تیار ہوا۔ لوگوں نے اسے دھر دبوچا۔ بہت کوشش کی کہ ان کے شکنجے سے نکل بھاگے مگر لوگوں نے اس کی کمر تک پتلون پہنا ہی دی۔ پتلون پہنتے ہی جیسے شرم سے گڑ گیا ہو۔ دونوں ہاتھوں سے بدن چھپا کر زور کی چھلانگ لگائی اور لوگوں کے نرغے سے نکل بھاگا۔ وہ چیخ رہا تھا۔

آج مجھے ظالموں نے ننگا کر دیا۔ نہ میں زمین کا رہا، نہ آسمان کا۔ تو لوگو! یہ جان لو کہ میں ترِی شنکو ہوں۔ عالم بزرخ کا دیوتا۔ عالم برزخ... عالم برزخ... عالم برزخ... اس واقعہ کے بعد گلی مزید سنسان اور تاریک ہو چکی تھی اور نئے مکیں کہیں اور منتقل ہو گئے تھے۔

□□□

سورج ابھی جاگ رہا ہے

خورشید حیات
کوارٹر نمبر 16/3، نیو این ای کالونی، بلاسپور
موبائل: 9752475934

اکتوبر کی ایک شام تھی۔ میں دفتر سے چھوٹتے ہی گھر جانے کے لئے باہر نکلا ہی تھا کہ تیز آندھی چلنے لگی۔

آندھی کیوں آتی ہے نغمہ ؟

آندھی کا اس زمین سے کیا رشتہ ہے ؟

تم بھی کیسے آدمی ہو ؟ زندگی کی اتنی منزلیں طے کر چکے، اور اس طرح کا سوال پوچھتے ہو۔ اس طرح کا سوال تمہاری زبان سے اچھا نہیں لگتا۔ یہ سوال بشریٰ اور عائشہ نے پوچھا ہوتا تو سننے میں بھی اچھا لگتا اور جواب دینے میں بھی۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے، جب میں یونیورسٹی سے واپس لوٹی تھی اور گھر میں داخل ہوتے ہی بشریٰ سوال پوچھ بیٹھی تھی۔

''اماں! سورج گرہن کیسے لگتا ہے ؟''

''بیٹی تھوڑا آرام تو کر لینے دو، ابھی تو میں..........''

''آرام، آرام تو حرام ہے ماں'' بشریٰ بول پڑی تھی۔

''اچھا بابا سنو! جب سورج اور زمین کے بیچ میں چاند آ جاتا ہے تو سورج گرہن لگتا ہے۔''

''اماں جب سورج اور چاند کے بیچ میں زمین آ جائے تو ؟''

تب چاند گرہن لگے گا، کیونکہ زمین، سورج کا چکر لگاتے لگاتے، سورج اور چاند کے بیچ آ جاتی ہے۔

بشریٰ کے سوالوں کا جواب دیتے وقت مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا تھا، آفتاب! جب ہم دونوں کالج کے دوستوں کے ساتھ Excursion میں آگرہ گئے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھی تاج محل کے سامنے الگ الگ پوز میں تصویر کھنچوانے میں لگے تھے اور ہم دونوں کبھی تاج محل کو دیکھتے تو کبھی جمنا کی لہروں کو اور پھر لہروں کے بیچ مجھے ایک آواز سنائی پڑی تھی۔

''نغمہ تم چاند جیسی ہو''

اور آفتاب تم ؟ میری زبان سے اچانک یہ جملے نکل پڑے تھے۔ یہ جانے بغیر کہ ابھی جو آواز میرے کانوں میں سنائی پڑی تھی، وہ آفتاب کی تھی یا پھر جمنا کی لہروں کی۔ مگر آفتاب کی آوازیں بھی تو جمنا جیسی ہیں۔

لہر لہر/ بہتا پانی/ پاک پانی/ ناپاک لوگ
لہر لہر بہتا پانی/ اونچی عمارت/ بونے لوگ

میرے اندر شاید تم بول رہے تھے، یا پھر میرے اندر بیٹھے ''میں'' نے لفظوں کو نئی زبان دے ڈالی تھی۔ سارے کے سارے لفظ بول رہے تھے۔ میرے وجود کے اندر دل کی گہرائیوں میں کہ میرے ہونٹ نہیں ہلے تھے۔ مگر تم نے میرے اندر کی آواز سن لی تھی۔ تبھی تم نے کہا تھا۔

''وہ کوئی عمارت ہے یا بیٹھا ہے کوئی فرشتہ۔ سنا رہا ہے وہ کہانی کریم خاں کی۔''

''نغمہ، کریم خاں تو تاریخ کے صفحات سے گم ہو گیا ہے، آؤ جمنا کے تٹ پر، ان کے کٹے ہوئے ہاتھوں کو تلاش کریں۔''

''کٹے ہوئے ہاتھ..............''

میں تمہاری فلاسفی کچھ کچھ سمجھ پائی تھی اور کچھ کچھ نہیں اور جو نہیں سمجھ پائی تھی وہ مدتوں بعد حقیقت بن کر سامنے آئی۔ پتا نہیں وہ لمحہ بھی تمہیں یاد ہے کہ نہیں کھانے پینے کی ملاوٹ نے تمہاری یادداشت کو کمزور بنا دیا ہے۔ جس طرح بدرنگ ہو گیا ہے تاج محل فضائی آلودگی سے۔

''اماں! اماں!! تم کہاں کھو گئیں ؟''

''زمین سورج کا چکر کیوں لگاتی ہے، اماں!؟''

بشریٰ اماں کو کھویا دیکھ کر سوال پوچھ بیٹھی۔ اچانک بشریٰ کے اس سوال نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ ماضی کا سفر طے کرتے ہوئے میں نے حال میں قدم رکھا اور پھر جواب دینے لگی۔

دیکھ بیٹی! اگر زمین سورج کا چکر نہیں لگائے گی تو دن اور رات نہیں ہوں گے۔ یہ اس کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کائنات کی ہر تخلیق کسی کے اشارے پر چل رہی ہے۔ یہ تم ابھی نہیں سمجھو گی۔ تھوڑا بڑا ہونے کا انتظار کرو۔ ویسے تم اور تمہاری نسل اس عمر میں ہم سے زیادہ باشعور ہے۔ ہم سے آگے ہے کہ ہم تمہاری عمر میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ بڑے معصوم تھے ہم!

بشریٰ سوال پر سوال پوچھے جا رہی تھی اور میں اس کے سوالوں کا جواب دیتی جا رہی تھی۔ تبھی عائشہ جو پڑوس میں شیاملا میڈم سے پڑھنے گئی تھی واپس لوٹ آئی تھی۔ بشریٰ کو میرے پاس بیٹھا دیکھ کر وہ بول

پڑی۔

کیوں بشریٰ؟ اماں کے پاس کیا کر رہی ہے؟ اس سے پہلے کہ بشریٰ بولتی میں بول پڑی تھی۔

پہلے اپنی کتابوں کا تھیلا تو رکھ آؤ بیٹی!

کتابوں کا بوجھ جیسے مہنگائی کا بوجھ، اف! میں دھیرے سے بڑ بڑائی تھی۔ عائشہ بھی تو اب بڑی ہو رہی تھی۔ کتابوں کے تھیلے کو پیٹھ سے الگ کرتے وقت ایسا لگا جیسے اس نے خود کو خود سے الگ کر دیا ہو۔ اس نے سوچا اس کا وزن تو صرف پندرہ کیلو ہے۔ مگر ان کتابوں کا وزن۔ کلاس میں دیے گئے، ٹیچر کے لکچر کا وزن، ہوم ورک کاپیوں کا وزن۔

عائشہ اپنے تھیلے کو ٹیبل پر رکھ کر بشریٰ کے پاس آ گئی۔

''آپا! تم اماں کو کیوں تنگ کر رہی ہو۔ اسکول سے آنے کے بعد تمہارے پاس اور کوئی کام نہیں ہے کیا؟''

''بس ایک سوال رہ گیا ہے۔ اسے پوچھ لینے دو۔'' بشریٰ بول پڑی۔

اچھا تو پوچھو جلدی سے عائشہ بولی۔

''آندھی کیوں آتی ہے اماں!''

''بش بیٹے!''

میں نے ابھی جواب دینا ہی چاہا تھا کہ بش بول پڑی۔

''اماں تم ناموں کو توڑ مروڑ کر انہیں گھریلو روپ میں ڈھالنے کی کوشش کیوں کرتی ہو؟ بشریٰ جیسے اچھے نام کا تو تم نے قتل کر دیا۔ میری سہیلیوں کی مائیں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔ اندرا کو اندو۔ فاطمہ کو فاطو اور لڑکے دوستوں کی مائیں رحیم کو رحیمو، اسلام کو اسلمو ....ایسا کیوں کرتی ہیں مائیں؟؟

بیٹی ناموں سے کیا لینا دینا۔ نام تو صرف پہچان کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ چھوڑو ان باتوں کو، اپنے سوال کا جواب سنو۔

زمین جب گرم ہو جاتی ہے تو ہوا بھی گرم ہو جاتی ہے اور ہوا گرم ہو جانے کے بعد ہلکی ہو کر اوپر اٹھنے لگتی ہے، جس سے خالی جگہ ہو جاتی ہے۔ اس خالی جگہ کو بھرنے کے لئے آندھی آتی ہے۔

''اور کچھ..........؟''

اب کچھ نہیں پوچھنا ہے۔ تھوڑا کھیلنے کے بعد ہوم ورک بھی کرنا ہے۔ ہم بچے تو کتابوں کے بوجھ تلے اپنی معصومیت کھوتے جا رہے ہیں۔

وہ تو اکتوبر ۱۹۸۸ء کی شام تھی اور آج اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شام ہے۔ بشریٰ نے جب یہ سوالات پوچھے تھے تو اس کا وزن صرف بیس کیلو تھا۔ اور اس کی کتابوں کا، لفظوں کا، سوالوں کے اننت سلسلوں کا۔ یہ بھی ایک سنجوگ ہے آفتاب کہ تمہاری زبان سے بھی آج وہی سوال نکلا جو بشریٰ نے پوچھا تھا۔

دس سال پیچھے کا سفر طے کر کے میرے اندر واپس لوٹ آئی تھی، نغمہ!

''آفتاب، کیا تم بشریٰ جیسے ہو گئے؟''

نہیں، نہیں! میں تو آفتاب ہوں اور میری عمر تو ..... چھوڑو عمر سے کیا لینا دینا کہ اپنی عمر تو ہر شخص چھپاتا ہے کہ شاید اسے خود کو بوڑھا ہوتا ہوا دیکھنا پسند نہیں، کہ شاید ڈر لگتا ہے موت کے قریب جاتے دیکھ کر۔

میرے اندر یہ کون بول رہا ہے۔ میں تو آفس کے باہر اسکوٹر اسٹینڈ میں کھڑا ہوں اور آندھی تیز تیز چل رہی ہے۔ میں آندھی کا مقابلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ میں شعور کی رو میں بہہ رہا ہوں۔ حال کا مقابلہ کرنے میں تو خود کو معذور محسوس کر رہا ہوں مگر ماضی اور مستقبل میرے اندر ضرور ہچکولے لے رہے ہیں۔ میرے اندر کبھی بشریٰ اور کبھی عائشہ الگ الگ شکل میں ابھر رہی ہیں اور ڈوب رہی ہیں۔

میں حیرت زدہ کھڑا ہوں۔ نئے سرے سے آندھی اور تاریکی کی کش مکش کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے۔ ہوا کی سنسناہٹ بڑی بھیانک لگ رہی ہے۔

اسکوٹر اسٹینڈ لوگوں سے بھرا پڑا ہے کہ سارے لوگ گھر جائیں تو کیسے، آندھی کا مقابلہ کون کرے کنٹرول آفس کے باہر یوکلپٹس کا پیڑ بھی آندھی کا مقابلہ کرتے کرتے گر پڑا تھا۔ اس کی شاخیں الگ الگ خانوں میں بٹ چکی تھیں، زمین سے آ لگی تھیں۔ ان کے بازوؤں کو آدمی کے بازوؤں کی طرح نہیں جوڑا جا سکتا تھا کہ آدمی کے کٹے ہوئے بازو تو جوڑے بھی جا سکتے ہیں مگر اس پیڑ کے؟

''گھور جھاڑ طوفان کے بے بند بیا'' بار پنڈا جی بول پڑے۔

''اے طوفان سمتو لوپاٹ کورے دیبو'' شوکانتو گھوش زور زور سے بڑبڑا رہے تھے۔ آفس کے بڑے بابو اس آندھی اور طوفان کے آگے خود کو بونا محسوس کر رہے تھے۔ اپنے ہونٹ سے بیڑی دبائے دھواں چھوڑتے ادھر ادھر اسکوٹر اسٹینڈ میں ٹہل رہے تھے۔

سچائی بیڑی کا دھواں ہے جو فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔

دھواں دھواں سچائی
دھواں دھواں زندگی
ہونٹوں سے دبی بیڑی
زندگی کے بوجھ تلے دبی
سچائی/ایمانداری/خلوص/اپناپن..........
انسان، انسان کہاں رہ گیا ہے؟

وہ تو بھاگا جا رہا ہے تیز دھوپ میں، بارش میں، ہانپتا ہوا کانپتا ہوا منزل کا کوئی پتا نہیں ہم کون ہیں؟ ہماری پہچان/ہمیں اس دھرتی پر کیوں بھیجا گیا/ہم سب کدھر جا رہے ہیں/ہم کچھ ہیں، تبھی تو ہیں کچھ نہ ہوتے تو بنائے کیوں جاتے؟؟

ہوائیں ہمارے لئے رحمت
ہوائیں ہمارے لئے ہلاکت کا سبب/ ہوائیں ہماری زندگی کی علامت
ان ہواؤں پر کس کا اقتدار ہے ؟
ہوائیں، کبھی سرد، کبھی گرم۔ کبھی نہایت خوش گوار، کبھی تباہ کن
آندھی/ طوفان/ ہوائیں ہمیں جلاسکتی ہیں/ ہوائیں ہمیں مٹاسکتی ہیں۔

ہم آگے بڑھ رہے ہیں، ہر آنے والا کل ہماری ترقی کی علامت ہے۔

ساری دنیا انٹرنیٹ میں سمٹ گئی ہے۔ مگر آندھی کا راستہ ہم روک نہیں سکتے۔ فطرت سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔

فطرت کہانی کہہ رہی تھی۔ فطرت کہانی سن رہی تھی۔ اور ہم اس کی کہانی میں مختلف رول ادا کر رہے تھے۔

''قسم ہے ان ہواؤں کی جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں
پھر طوفانی رفتار سے چلتی ہیں
اور بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں
پھر ان کو پھاڑ کر جدا کرتی ہیں''

میرے اندر یہ کون بول رہا ہے۔ میں شعور کی رو میں کیوں بہہ رہا ہوں۔ میرے اندر الگ الگ چہرے کیوں ابھر رہے ہیں۔ کیوں ڈوب رہے ہیں ؟
ڈوبتی، ابھرتی زندگی
لہر، لہر، زندگی
لہریں زندگی کی علامت
ہوائیں ہماری تہذیب کی نشانی
مٹتی ہوئی ہماری تہذیب/ ہماری ثقافت/ ہمارا کلچر
تیز اٹھتی ہوئی ہوائیں
سر......سر......سر بہتی ہوا
سائیں سائیں کرتی ہوا
حیوانی اور نباتی زندگی بخشتی ہوا
انسان اور جانور کو اکھاڑ پھینکتی ہوا

سارے کے سارے لوگ دہشت زدہ اور مبہوت ہیں۔ خوف، دہشت، گھبراہٹ، اضطراب ہر ایک کے چہروں پر عیاں ہو رہا ہے۔ اس ہوا کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ ہوا تو ہماری زندگی کی علامت تھی۔ مگر آج یہ سب کچھ ختم کئے جا رہی تھی۔

میں پانچ سیڑھیاں نیچے اتر کر اسٹینڈ سے باہر آ گیا۔ آندھی اب بھی چل رہی تھی۔ آندھی کے رکنے کا انتظار کب تک کیا جاسکتا تھا۔ گھر میں بیوی، بچے بھی انتظار کر رہے ہوں گے۔ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ بیوی، بچوں کا خیال آتے ہی میں باہر نکل پڑا۔ مجھے باہر نکلتے دیکھ گھوش بابو، بار پنڈا جی اور اسکوٹر اسٹینڈ میں کھڑے سارے کے سارے لوگ میرے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ آندھی کے تیز تھپیڑوں نے ہم سب کو میٹرو ریلوے تک پہنچا دیا۔ ہم سب اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر رہے تھے کہ ہم سب زمین کے نیچے بنے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ لوگوں کا جوم لوکل ٹرین کے انتظار میں کھڑا تھا۔

پلیٹ فارم پر جمع ہوتی ہوئی بھیڑ۔ سیڑھیوں سے اترتی گھبراہٹ، بے چینی اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ زمین کے اوپر آندھی اب بھی چل رہی ہے۔

میں بھی اور لوگوں کی طرح کمزور ہو چکا تھا آندھی کا مقابلہ نہیں کر سکا اور زمین کے اندر بچھی ریلوے لائن پر چلنے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ چلتی گاڑی کے تجربے بھی عجب ہوتے ہیں۔ بغل والی سیٹ پر بیٹھے فادر ور گیس بول رہے تھے انگریزی میں کہ شاید انہیں اپنی زبان اور اپنے سفید لباس سے بڑی محبت تھی۔ ٹرین میں سوار باقی لوگوں کو اپنی، اپنی تہذیب/ زبان سے محبت ہے کہ نہیں معلوم نہ ہو سکا کہ فادر کے ساتھ سبھی لوگ انگریزی میں باتیں کرنے لگے۔ فادر بول رہے تھے۔

باقی ص نمبر ۳۴ پر...

شہاب جعفری
۱۹۳۰ء — ۲۰۰۲ء

غزل

قید امکاں سے تمنا تھی کہیں چھوٹ گئی
پاؤں ہم نے جب اٹھایا تو زمیں چھوٹ گئی

لیے جاتا ہے خلاؤں میں جمال شب و روز
دن کہیں چھوٹ گیا رات کہیں چھوٹ گئی

زندگی کیا تھی میں اک موج کے پیچھے تھا رواں
اور وہ موج کہ ساحل کے قریں چھوٹ گئی

بود و باش اپنی نہ پوچھو کہ اسی شہر میں ہم
زندگی لائے تھے گھر سے سو یہیں چھوٹ گئی

دل سے دنیا تک اک ایسا ہی سفر تھا جس میں
کہیں دل اور کہیں دنیائے حسیں چھوٹ گئی

صبح دم دل کے مکاں سے سبھی رشتے ٹوٹے
در و دیوار سے فریاد کہیں چھوٹ گئی

کیا غریب الوطنی سی ہے غریب الوطنی
آسماں ساتھ چلا گھر کی زمیں چھوٹ گئی

چلے تو پاؤں کے نیچے کچل گئی کوئی شے
نشے کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے

اپنی ڈھب کا انوکھا شاعر شہاب جعفری، ادبی حلقوں میں شاعری سے زیادہ ان کی شخصیت ہمیشہ توجہ کا مرکز بنی رہی۔ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے لیکن انہوں نے بڑی بیباک غزلیں بھی کہیں۔ ان کی نظموں میں سورج، چاند، سمندر، پانی، پتھر اور ہوا جیسے الفاظ کا استعمال بطور استعارہ کیا گیا ہے اور علامت سازی کا انداز بھی منفرد ہے لیکن سورج اور اس کے دیگر تلازمات ان کی شاعری کا کلیدی موضوع ہے۔ ایک ہی مجموعۂ کلام کے شاعر اور اس کا نام 'سورج کا شہر'۔ شہاب جعفری کی زیادہ تر نظمیں اور اس کے بیانیہ کو نثری اصطلاح سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے حالانکہ ان کا بیانیہ بہت ہی مضبوط اور تہہ دار ہے جو کہ مدت تک موضوع بحث رہا۔

ان کی شاعری دانشورانہ فکر سے بھرپور ہے اور انہوں نے ہر اس مقام پر لو جالینے کی کوشش کی ہے جہاں سے عام طور پر لوگ بچ کر نکل جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے آئے ہیں۔ ان کی شاعری خون میں گرمی پیدا کرتی ہے۔ یہی ان کی شاعری کا سب سے بڑا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی اصطلاحیں اور نئی تراکیب کو گڑھنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے مروجہ الفاظ کو ایک نیا آہنگ عطا کیا۔ ادارۂ نیا دور کی جانب سے شہاب جعفری کے ۸۸ ویں یوم ولادت کے موقع پر پیش ہے ان کی دو غزلیں اور ایک نظم

شہرِ انا میں

یہ تیز دھوپ یہ کاندھوں پہ جاگتا سورج
زمیں بلند ہے اتنی کہ آسماں کی رقیب
وہ روشنی ہے وہ بیداریاں کہ سائے نہ خواب
بس ایک ہوش بس اک آگہی بس اک احساس
اور ان کے نور سے جلتے بدن پگھلتے بدن
بدن ہیں کھولتے سیال آئینے ہر سو
ہر آن بہتے سدا ہیئتیں بدلتے بدن
دماغ دور سے ان کا نظارہ کرتا ہے
اور ان کے قرب کے اظہار سے سنورتا ہے
وہ روشنی ہے کہ از فرد تا بہ فرد تمام
کسی کی شکل نہ صورت کسی کا رنگ نہ روپ
تمام انفس و آفاق گم ہیں آپس میں
ہیں فرد فرد کی پرچھائیاں بھی دھوپ ہی دھوپ
سب اپنے علم کا جادو ئے سامری لے کر
ہزار آنکھوں سے اک دوسرے کو دیکھتے ہیں
رواں دواں ہیں سب اک دوسرے کو دیکھتے ہیں
اور اتنا جان چکے ہیں سب ایک دوسرے کو
کچھ اتنی دور نکل آئے ہیں سب اپنے سے
کہ دل کے رشتوں کو اب مانتا نہیں کوئی
کسی کو اپنے سوا جانتا نہیں کوئی

غزل

اس دھوپ سے کیا گلہ ہے مجھ کو
سائے نے جلا دیا ہے مجھ کو

میں نالۂ سکوت سنگ کا ہوں
صحرا نے بہت سنا ہے مجھ کو

میں لفظ کی طرح بے زباں تھا
معنی نے ادا کیا ہے مجھ کو

ہر سچ کا نصیب سنگ ساری
اور سچ ہی سے واسطہ ہے مجھ کو

خائف نہیں مرگ ناگہاں سے
جینے کا وہ حوصلہ ہے مجھ کو

پتھر پہ مری صدا کا سایہ
آئینہ دکھا رہا ہے مجھ کو

آواز دے مجھ کو تیرگی میں
آواز ہی نقش پا ہے مجھ کو

...بقیہ ص ۱۳ کا

A PERSON TRAVELLING BY PASSENGER TRAIN CONSCIOUSLY OR UNCONSCIOUSLY EXPERIENCES MANY THINGS, WHICH ARE THOUGHT PROVOCATING AND LEAVES NUMBER OF LESSONS FOR U S . A VERY COMMON EXPERIENCE IS THA T WHEN THE TRAIN MOVES FAST THE PASSENGERS SITTING INSIDE ITS COMPARTMENT FEEL THEMSELVES STATIC, WHILE EVERYTHING OUTSIDE THE WINDOW LOOKS TO BE FAST RUNNING IN TH EOPPOSITE DIRECTION. THIS GIVES US BITTER EPERIENCE OF LIFE ALSO.”

میں نے فادر ورگیس کی باتوں کا جواب اپنی مادری زبان میں دیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ لوکل ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں ہمارے ملک کی الگ الگ زبان میں الگ تہذیب سمٹ کر بیٹھ گئی ہو۔

ٹرین تیز رفتاری سے آگے کی طرف بڑھتی جارہی تھی۔ شیشے کی کھڑکیاں اور دروازے سبھی بند تھے۔ کش مکش۔ معنی کی تلاش۔ افسردگی اور میں!

ہر پلیٹ فارم پر ٹرین رکتی ہے اور ایک ہنگامہ کھڑا ہوجاتا ہے۔ لوگ تیزی سے اندر داخل ہوتے ہیں۔ افراتفری سی مچ جاتی ہے اور پھر ٹرین چلنے لگتی ہے کہ شاید رفتار کا مسئلہ حل ہورہا ہے۔ زندگی ایک سفر ہے اور سفر زندگی کی علامت۔ مجھے مسلسل سفر میں رہنا چاہئے۔ مگر یہ میرے اختیار میں نہیں۔ ٹرین آخری اسٹیشن پر رک چکی تھی۔ میں باہر نکل آتا ہوں زمین کے اندر بنے پلیٹ فارم سے باہر کے فٹ پاتھ پر!

آندھی تھم چکی تھی اور انسان حرکت میں آچکے تھے۔ سبھوں کے قدم اپنے اپنے گھروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں
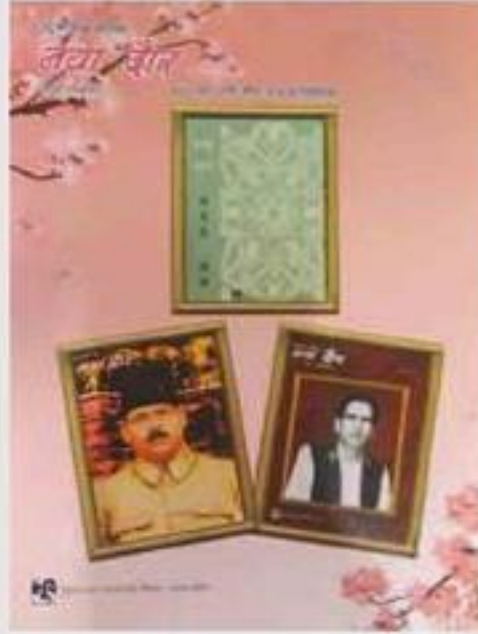
’نیا دور‘ نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ’اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر‘ بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ ’نیا دور‘

سوکھے پتے آندھی اور طوفان کا مقابلہ کیوں نہیں کرپاتے؟

درختوں کی شاخیں الگ کیوں ہوجاتی ہیں

صنوبر کا پیڑ اپنی جڑوں سے الگ کیوں ہوجاتا ہے/ہری، ہری نرم گھانسیں سجدہ میں کیوں چلی جاتی ہیں ؟

کچے مکانوں کی چھتیں کیوں اڑ جاتی ہیں؟

کمزور عمارتیں کیوں گرجاتی ہیں

ملا بخش سبھوں کی مرادیں پوری کرنے والا کیوں بن جاتا ہے۔

ہرے بھرے درخت جو زہریلی گیس کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں، فضائی آلودگی کو کم کرتے ہیں، وہ درخت جو آکسیجن ہمیں مفت بانٹا کرتے ہیں۔ آندھی، ان کے بازوؤں اور ان کی جڑوں کو تلوار کی تیز دھار بن کر کیوں کاٹ ڈالتی ہے۔ طوفانی ہوا تھم چکی تھی۔ مگر مجھے اپنے پاؤں زمین سے اکھڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنی بنیاد سے جدا ہو کر ایک طرف جھک گیا ہوں۔ لمبی چوڑی سڑک کے کنارے کھڑی ان اونچی عمارتوں کی طرح جو اپنی بنیاد سے الگ ہو کر دائیں جانب جھک گئی تھیں۔ ٹیلی فون کے ان کھمبوں کی طرح جنہیں طوفانی ہوا نے ایک طرف جھکا دیا تھا۔ فٹ پاتھ کے کنارے روتی ہوئی انسانیت کی طرح جو تڑپ تڑپ کر دم توڑ چکی تھی۔ آندھی آئی اور چھوڑ کر چلی گئی۔ روتی دم توڑتی انسانیت کی تاریخ! زندگی دھیرے دھیرے معمول پر آنے لگی تھی۔ سفید پڑ چکے چہرے پھر سے رنگین ہوتے جارہے تھے۔ لوگوں کے دلوں سے آندھی کا خوف نکل چکا تھا۔ بچے ہوئے درخت پھر سے تن کر کھڑے تھے۔ جیسے یہ آندھی پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے گی۔

مگر طوفانی ہوا تو چلتی رہے گی۔ آندھی تو آتی رہے گی۔ زمین زلزلوں سے ہلائی جاتی رہے گی کہ سورج ابھی جاگ رہا ہے۔

□□□

بچپن کا ایک خواب

پرویز شہریار
فلیٹ نمبر 4 / NCERT،48 کیمپس، شری اربندو
مارگ، نئی دہلی موبائل: 9910782964

سدرہ نے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا اور آج اُسے اس کے خواب کی تعبیر مل گئی تھی۔ اس کا سپنا سچ ہوگیا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے ذہن کا پرندہ حال کی قید سے آزاد ہوکر ماضی کے کھلے آسمان میں اپنے پنکھ پھیلائے محو پرواز ہوگیا تھا ... ..

''میں آئی اے ایس بنوں گی!''

شمیم سر کے جواب میں اُس نے کہا تھا۔

اُسے یاد آیا ... ..

جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُس وقت اردو کی کلاس میں پٹنہ سے ایک نئے ٹیچر آئے تھے۔ اُن کا نام تھا سید محمد شمیم۔ اُنھوں نے سبھی طالب علموں کے تعارف مکمل ہونے کے بعد باری باری سے دریافت کیا تھا کہ ہم بڑے ہوکر کیا بننا چاہتے ہیں۔ زیادہ تر بچوں نے اپنے جواب میں کہا تھا۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔ میں انجینئر بننا چاہتا ہوں۔ کسی نے کہا میں ٹیچر بننا چاہتی ہوں۔ کسی نے فوج میں بھرتی ہوکر ملک کی حفاظت کرنے کی خواہش ظاہر کی تو کسی نے وکیل بن کر لوگوں کو انصاف دلانے کی آرزو ظاہر کی۔ کچھ بچوں نے نیتا بننے کی خواہش کا اظہار کیا، اس پر سبھی ہنس پڑے تھے۔ شمیم سر بھی سن کر ہنسنے لگے تھے۔ لیکن جب میری باری آئی تو میں نے بڑی متانت سے کہا۔

''میں آئی اے ایس بننا چاہتی ہوں!''

میرا جواب سن کر سبھی بچے سنجیدہ ہوگئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ آئی اے ایس کے بارے میں بہت کم بچوں نے سُن رکھا تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اس کے بارے میں بچوں کو بالکل بھی معلومات نہیں تھی، تو غلط نہ ہوگا۔ شمیم سر نے مجھ آئی اے ایس کا فُل فارم بتانے کو کہا تو میں نے بلاتوقف بتادیا۔

انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس۔

شمیم سر نے فوراً اس کی وضاحت کی اور پوری کلاس کو مخاطب کر کے سمجھایا کہ انگریزوں نے حکومت کے کام کاج چلانے کے لیے سول سروس کا امتحان شروع کیا تھا۔ دورِ غلامی میں جو ہندوستانی اس امتحان کو پاس کر لیتے تھے، اُن کی سول سروس کے تین شعبوں میں سے کسی ایک میں تقرری کر لی جاتی تھی۔

شمیم سر نے اس کے تینوں شعبوں کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس، اینڈین پولس سروس اور انڈین فورین سروس جن کو شارٹ فارم میں بالترتیب آئی اے ایس، آئی پی ایس اور آئی ایف ایس کہا جاتا ہے۔ ہمارے آزاد ملک میں اس کا امتحان ہر سال یونین پبلک سروس کمیشن کراتی ہے۔ اس یو پی ایس سی کے امتحان کے تین حصے ہوتے ہیں۔ پریلم ٹیسٹ، مینس امتحان اور انٹرویو۔ ایسے امیدوار جو معلوماتِ عامہ، منطق اور ریاضی کے معروضی سوالات پاس کر لیتے ہیں، انھیں مینس میں اپنے سات مضامین سمیت کسی دو اختیاری مضامین کے وضاحتی امتحانات پاس کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد انٹرویو کی باری آتی ہے جس میں امیدواروں کے شخصی اوصاف جاننے کے لیے انٹرویو بورڈ کے ارکان مختلف طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ اگر امیدوار نے اپنی حاضر دماغی، ہوشیاری، دیانت داری اور عقلمندی کے ساتھ بورڈ کو مطمئن کر دیا تو ان میں سے بہترین امیدواروں کا انتخاب عمل میں آجاتا ہے۔ اس طرح ایک گریجویٹ جس کی عمر اکیس سے کم اور بتیس سال سے زیادہ نہ ہو وہ سول سروس کے مقابلہ جاتی امتحان میں شرکت کر سکتا ہے۔

سدرہ نے جس دن بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا، اُسی دن سے وہ یو پی ایس سی کی معلومات جٹانے میں سنجیدگی سے لگ گئی تھی۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ اس امتحان کو پاس کرنے کے لیے کسی بھی امیدوار کو کل چھ موقعے دیے جاتے ہیں تو اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا تھا۔ اُس نے مزید جانکاری حاصل کی تو پتہ چلا کہ اس امتحان کے لیے ہر سال جنوری فروری میں انٹرنیٹ کے ذریعے upsc.gov.in کی ویب سایٹ پر جا کر فارم آن لائن بھرا جاتا ہے۔ پریلم ٹیسٹ پاس کر لینے کے بعد عموماً جون کے مہینے میں مینس کے وضاحتی امتحانات کے لیے بلایا جاتا ہے۔

سدرہ کو سب سے زیادہ خوشی یہ جان کر ہوئی تھی کہ وہ مینس کے وضاحتی امتحانات اپنی مادری زبان اردو کے ذریعے بھی دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اُسے صرف ایک پیپر انگریزی کا بھی پاس کرنا لازمی ہوگا۔

امتحان کی تیاری کے دو سال اتنی طوفانی رفتار سے گزر گئے تھے کہ سدرہ کو کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ آج وہ نشاط انگیز لمحات موسم باراں کی بجلی کی طرح رہ رہ کے

اس کے ذہن پر کوند رہے تھے ، اسے وہ انتہائی مسرور کن لمحہ یاد آرہا تھا، جب اس نے یو پی ایس سی کی ویب سائٹ پر اپنا ریزلٹ دیکھا تھا۔ کامیاب امیدواروں کی فہرست میں اوپر سے اس کا نام دسویں نمبر پر تھا۔ اُس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس کا سر خود بخود سجدۂ شکر میں جھک گیا تھا۔

بہت ہی غربت میں اس نے ابتدائی زندگی بسر کی تھی۔ لیکن گھر میں تعلیم کا ماحول تھا۔ اس کے والد مشتاق صاحب کسی کالج کے لائبریرین تھے۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا، ہر وقت اپنے والد کو مطالعہ میں غرق پایا تھا۔ اسے خود بھی مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ ہر طرح کی اچھی اچھی کتابیں اس کی شخصی لائبریری اور مطالعے کے ٹیبل پر موجود رہتی تھی۔ اپنے سبھی بھائی بہنوں میں وہ سب سے چھوٹی تھی۔ اس سے بڑے دو بھائی تھے اور ایک بڑی بہن تھی۔ لیکن ماں باپ کی وہ لاڈلی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی جماعت میں وہ ہر سال اوّل آتی تھی۔

اُسے وہ دن یاد آرہے تھے۔ جب اُس کے خالو جان نے اُسے بتایا تھا۔ جمہوری نظام حکومت میں سیاسی جماعتیں انتخاب میں جیت حاصل کر کے حکومت سازی کرتی ہیں۔ لیکن اصل میں حکومت کے احکامات کا اطلاق آئی اے ایس آفیسر کے ذریعے پائے تکمیل کو پہنچتا ہے۔ حکومت چلانے کے لیے وزرا رہنمائی کرتے ہیں کہ ملک کو کس طرح ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ حکومت کے احکامات کو عملی جامہ پہنانے میں ہماری انتظامیہ، جوڈیشری، قانون ساز اسمبلی اور محکمہ پولیس مدد کرتی ہے۔

سدرہ آفرین کو اپنے خالو کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی کہ کس طرح انھوں نے مزید وضاحت کے ساتھ اس کے شبہات دور کیے تھے۔

نظام تعلیم، صحت عامہ، شہر کاری، صنعت کاری، زراعت اور ملازمت وغیرہ کے مختلف شعبوں میں مرکزی اور ریاستی حکومتیں کس طرح پالیسیاں وضع کرتی ہیں۔ لیکن ان منصوبوں اور پالیسیوں کو نافذ کرنے میں ان ہی آئی اے ایس آفیسروں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

سدرہ کو اپنے خالو جان سے کافی ترغیب ملی تھی۔ اس کے خالو ضلع مجسٹریٹ تھے۔ انھوں نے بھی اپنے زمانے میں سول سروس کا مقابلہ جاتی امتحان پاس کیا تھا۔ اُن کی تعلیم بی اے، ایل ایل بی کی تھی۔

پھر سدرہ کی زندگی میں وہ خوب صورت لمحہ بھی آیا جب اُس نے بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا اور پوری ریاست کے تعلیمی بورڈ میں اسے اوّل پوزیشن ملی تھی۔ اپنے اتنے اچھے ریزلٹ سے اس کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ وہ بہت پُر امید تھی کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب آئی اے ایس آفیسر بننے سے اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔

سدرہ کی والدہ اس کے کھانے پینے کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ صبح پانچ بجے اُٹھ کر جب وہ مطالعہ شروع کرتی تو اس کی والدہ اس کی میز پر ایک گلاس گرما گرم دودھ رکھ دیا کرتی تھیں۔ اُسے کبھی سوچنا نہیں پڑا کہ آج وہ کون سا کپڑا زیب تن کرے گی۔ اس کی والدہ ہمیشہ اس کے پہننے اوڑھنے کا پورا بندوبست کر دیا کرتی تھیں۔

جب اُس نے پریلم ٹیسٹ میں کل دو سو میں سے ایک سو اسّی مارکس حاصل کر لیے تو اس کے اندر یکا یک خود اعتمادی پیدا ہو گئی اور اسے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اب اپنی منزل سے بس ایک قدم دور رہ گئی ہے۔ اب اسے پوری تندہی اور انہماک کے ساتھ اگلے سفر کی تیاری یعنی مینس امتحانات کی تیاری کرنی تھی۔ اس بار اُسے پریلم ٹیسٹ کے بر خلاف تفصیلی مضمون لکھنے اور وضاحتی سوالات حل کرنے کی مشق کرنی تھی۔ سدرہ نے بیک وقت کئی کئی اخبارات کے ایڈیٹوریل پیج پڑھنے شروع کر دیے تھے جس سے آتشیں مسئلوں کو مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھنے پرکھنے کی مشق ہو جاتی تھی۔ سدرہ نے تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات کے ساتھ ایک پیپر اردو ادب کا بھی رکھا تھا۔ ہر موضوع پر اُس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ خاص کر کے اردو ادب کی تاریخ اُسے اچھی طرح ازبر ہو گئی تھی۔ شخصی ٹیسٹ کے لیے اُسے الگ سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کیونکہ بچپن سے ہی وہ بہت مثبت رویے اختیار کرتی آئی تھی۔ کبھی کسی نا مساعد حالت سے ہار ماننا، اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک ضد تھی جو اُس نے دل میں ٹھان لیا، اُسے کسی بھی طرح وہ پورا کر کے ہی چھوڑتی تھی۔

وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ جب اُس نے مینس کے امتحانات بھی ساڑھے سترہ سو میں سے چودہ سو میں

ساقی فاروقی

'پاپ بیتی' ہو یا ان کی دوسری تخلیقات، ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ ساقی فاروقی کچھ لکھیں اور عالمی پیمانے پر سرخیوں میں نہ آئیں۔ ساقی فاروقی کی ۸۲ ویں سالگرہ کے موقع پر دسمبر ۲۰۱۸ء کا 'نیا دور' ساقی فاروقی پر مبنی ہوگا جس میں **بیدار بخت، اسد محمد خان، مشرف عالم ذوقی، زمرد مغل** وغیرہ کے مضامین شامل ہوں گے۔

مارکس کے ساتھ پاس کر لیے تھے۔

اللہ اللہ کر کے وہ بھی دن قریب آ گیا جب اُس نے یو پی ایس سی کا انٹرویو دیا۔ انٹرویو کے لیے اُس نے اپنا پسندیدہ موضوع پیڈ میڈیا یعنی بکاؤ ذرائع ترسیل رکھا تھا۔ موجودہ دور کے پرائیویٹ میڈیا پر اس کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ کوئی بھی خبر ہو بغیر تحقیق کے آسانی سے قبول نہیں کرتی تھی۔ آج اللہ نے آخر وہ دن بھی نصیب کر دیا جس کا بڑی بے صبری سے انتظار تھا۔ اُس کے گھر کے آنگن میں ہر طرف جشن کا ماحول تھا۔ یہ نظارہ دیکھتے ہی بنتا تھا۔ اس کے والدین اور سبھی بھائی بہن اُسے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اُس نے نا جانے کتنی پشتوں کے بعد خاندان کا نام روشن کیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔

پیڈ میڈیا کے سوال پر انٹرویو بورڈ کے سامنے اُس نے جس طرح سے اپنا موقف رکھا تھا۔ اس پر سبھی نے اس کی خوب ستائش کی تھی اور ٹیبل تھپتھپا کے اسے شاباشی دی تھی۔

جیسے جیسے دن ڈھلتا گیا، لوگوں کو خبر ملتی گئی اور شام ہوتے ہوتے، اچھی خاصی بھیڑ اکٹھی ہو گئی تھی۔ قرب و جوار میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ٹی وی کے لیے کچھ نیوز چینل کے رپورٹر سدرہ آفرین سے انٹرویو لیے رہے تھے، اخبارات کے ترجمان و نامہ نگار اس سے متعلق سوالات پوچھ رہے تھے اور کچھ فوٹو صحافی اس کی تصویریں لے رہے تھے۔ وہ اپنی کمیونٹی کی نمائندگی کر رہی تھی۔ ایسے سماج میں جہاں لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکوں کو ہر بات پر ترجیح دی جاتی ہے، اُس ماحول میں رہ کر آپ نے کیسے یہ مقام حاصل کر لیا۔ اس کے لیے آپ کو کتنی جدو جہد کرنی پڑی؟ اسی قبیل کے مختلف سوالات اس سے پوچھے جا رہے تھے۔

سدرہ ہر سوال کا بڑی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ جواب دیتی جا رہی تھی۔ کیونکہ اس کی زندگی کی یہ تلخ حقیقت تھی۔ اُس نے بہت غریبی سے اُٹھ کر یہاں تک کا تن تنہا سفر طے کیا تھا۔ سماج میں ایک مقام حاصل کیا تھا، جس سے اس کا پورا خاندان فخر سے سر اُٹھا کے چلنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی سدرہ آفرین کی آنکھیں مارے خوشی کے نم ہو گئیں۔

تبھی دل کے نہاں خانے سے آواز آئی۔

دیکھو، لوگو! میں نہ کہتی تھی۔

"آج میں آئی اے ایس آفیسر بن گئی!"

اس خیال کے آتے ہی سدرہ نے فرط جذبات سے لبریز ہو کر یکایک اپنی دونوں آنکھیں بھینچ لیں۔ تبھی سدرہ کی والدہ نے سامنے سے آ کر اسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا۔ وہاں موجود لوگوں نے دیکھا، اس وقت ممتا کے جذبے سے شرابور ایک ماں اپنی بچی کو کیسے اپنے سینے سے لگا کر پیار سے اس کی پیٹھ تھپک رہی تھی۔ یہ انسانی جذبات و احساسات کا درجۂ منتہا تھا جہاں پہنچ کر دونوں ماں بیٹی کی آنکھوں سے گنگا و جمنا جاری تھے۔

اور پھر، دیکھتے ہی دیکھتے، ان کے ارد گرد جمع بھیڑ نے اُنھیں خوشی و انبساط کے عالم میں وہیں تنہا چھوڑ دیا اور پھر کچھ ہی دیر میں وہاں سے سبھی اپنے اپنے رستے چل دیئے۔

شام کا دھندلکا اب دھیرے دھیرے پھیلنے لگا تھا اور دور مشرقی افق پر پورنماشی کا تازہ دم چاند اپنے نئے سفر کے آغاز کے لیے بڑے آب و تاب کے ساتھ اپنا رخت سفر باندھ رہا تھا۔

□□□

اردو زبان کا سیکولر کردار (حصہ اول)

دوسری زبانوں کے مقابلے اردو میں سیکولرزم کی پختہ روایت پر **پروفیسر مشیر الحسن** کا مقالہ

اردو کے مشہور و معروف شاعر **انور جلالپوری** کی شخصیت اور فن پر **وسیم بریلوی، نواز دیوبندی، منور رانا، افتخار امام صدیقی، مولانا عبدالعلی فاروقی، خوشبیر سنگھ شاد، سنجئے مصرا شوق، شفیع جاوید، احتشام افسر، شہریار** وغیرہ کے مضامین اور **بھگوت گیتا** کے منظوم ترجمے کے اقتباسات

اب جولائی ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع کیے جائیں گے۔

اس کے علاوہ ہندوستانی زبانیں، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر تخلیقات

غزل

خوش نہیں ہے کوئی بس یہ ہے کہ پردا رہ گیا
وہ بھی آزردہ ہے کٹ کر میں بھی تنہا رہ گیا

تشنہ لب اپنے سرابوں کی طرف بڑھتے رہے
پتھروں کی اوٹ میں چشمہ اکیلا رہ گیا

اس افق سے اس افق تک دھوپ میری مملکت
تیرے قبضے میں بس اک سائے کا ٹکڑا رہ گیا

دونوں جانب سے چلے پتھر، کئی پکڑے گئے
جس پہ ہنگامہ تھا وہ بچہ بلکتا رہ گیا

سب عناصر قتل کر کے بھاگنے والوں میں تھے
میری مٹھی میں ہوا کا ایک جھونکا رہ گیا

چاندنی تقسیم کی جائے گی دو دن صبر کر
اور اگر ان دو دنوں میں چاند آدھا رہ گیا

اے مظفرؔ لے گئی دریا کو وحشت کھینچ کر
دونوں ہاتھوں سے زمیں پکڑے کنارہ رہ گیا

مظفر حنفی
اے۔آئی۔ایم۔ایس۔اپارٹمنٹ،میور کنج،میور وہار،دہلی
موبائل: 9717581666

غزل

شہرِ طلب میں آئے ہو تو رونا دھونا مت کرنا
جن پلکوں پر خواب سجے ہیں اُن کو رُسوا مت کرنا

اپنے آپ سے جنگ بہت کی ہارے بھی اور جیتے بھی
اِک دن مجھ سے دل نے کہا تھا اپنا سودا مت کرنا

جانے کتنے عکس ملیں گے کتنے منظر وَنظر بھی
راہِ طلب شاداب بہت ہے اِس کو صحرا مت کرنا

اپنوں کی سوغات یہی ہیں دل پر ہوں یا روح پہ ہوں
اِن زخموں کو تازہ رکھنا اِن کو اچھا مت کرنا

دیکھو اِس آباد خرابے میں بھی کتنی رونق ہے
میرے حال پر رونے والو! دل کو چھوٹا مت کرنا

اپنی آنکھیں کھول کے چلنا شہر ہے یہ سفاک بہت
اُس کی یادیں ساتھ میں رکھنا خود کو تنہا مت کرنا

میں تو ضیاؔ ہر حال میں خوش ہوں، حاصل کیا لاحاصل کیا
مجھ سے نسبت رکھنے والو! تم بھی تماشہ مت کرنا

ضیاء فاروقی
10-H-K, MHKITC ،رفیقیہ اسکول روڈ، بھوپال
موبائل: 9406541986

غزل

جلوہ فرما وہ لبِ بام نہیں ہو سکتا
اُس کا نظارہ کبھی عام نہیں ہو سکتا

ماہِ کامل نظر آتا ہے ہمیشہ شب میں
وہ نمودار سرِ شام نہیں ہو سکتا

جو فقط عشقِ حقیقی سے سروکار رکھے
ایسا عاشق کبھی بدنام نہیں ہو سکتا

متحد ہو کے اگر امن سے سب لوگ رہیں
کوئی منظر لہو آشام نہیں ہو سکتا

شاعری کو مری پیغمبری سمجھے نہ کوئی
شعر تو شعر ہے، الہام نہیں ہو سکتا

بادہ نوشی سے علاجِ غمِ دل کیا ہوگا
اس لئے غرقِ مے و جام نہیں ہو سکتا

خونِ دل جس نے دیا کشتِ سخن کو مخمورؔ
وہ ادب میں کبھی گمنام نہیں ہو سکتا

مخمورؔ کاکوروی
68چودھری محلہ، کاکوری، لکھنؤ
موبائل: 9450097929

غزل

نہ التماس و گزارش نہ التجا ہے کوئی
نہ کوئی حرف دعا ہے نہ مدعا کوئی

کوئی شکایت و شکوہ بھی ہے تو خود سے ہے
فریب وقت سے ہرگز نہیں گلہ کوئی

لباس روح میں احساس لمس چھوڑ گیا
کچھ اتنے پاس سے ہوکر گزر گیا کوئی

یہ واقعہ بھی عجب ہے کہ قتل نور کے بعد
دھواں پکارتا ہے بجھ گیا دیا کوئی

انھیں بھی ترک مراسم سے اک ضرر پہنچا
کہ چاہ کر بھی نہ دے پائے غم نیا کوئی

وہ ایک دور کی آواز سب پہ چھائی رہی
بہت قریب سے دیتا رہا صدا کوئی

فصیل ضبط پہ رکھا ہوا چراغ ہوں میں
بجھا نہ پائے گی ہرگز مجھے ہوا کوئی

باقر مہدی
فرسٹ فلور، R-127/A، جوگابائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی
موبائل: 9313144221

غزل

خواب آنکھوں میں تم اس طرح سجایا نہ کرو
دل یہ کہتا ہے کہ اتنا بھی بھروسہ نہ کرو

کچھ زمانے کی نگاہوں میں تو رہنے دو بھرم
ہر گھڑی اپنی محبت کا تقاضا نہ کرو

اپنے الفاظ کا پتھر نہ چلاؤ مجھ پر
شیشۂ دل مرا اس طرح سے توڑا نہ کرو

وعدہ کرتے ہو تو قائم بھی رہو وعدوں پر
راہ چلتے ہوئے اب ہم کو جلایا نہ کرو

اس طرح دیکھ کے اے جان لرز جاتی ہوں
دل کی دنیا میں دبے پاؤں تم آیا نہ کرو

تم اگر ترک وفا کر بھی چکے ہو تو سنو!
میری جانب کبھی اب مڑ کے بھی دیکھا نہ کرو

ٹوٹ کر چاہو مری طرح سے تم بھی نشاطؔ
مری آنکھوں میں رہو اور ستایا نہ کرو

نشاط فاطمہ
سبزی باغ، پٹنہ
موبائل: 7543978955

غزل

وہ آئے میرے خواب میں تاخیر کے بغیر
میں خوش ہوں ان کی کاغذی تصویر کے بغیر

وہ مطمئن نہیں رہا ایام کیف میں
کیا چین آئے عشق کو زنجیر کے بغیر

ان کی ادائے ناز رہے دل کھینچ کر فرار
تاثیر کن رہی وہ کسی تیر کے بغیر

ہے اس کے حرف حرف میں پیچیدگی نہاں
سمجھوگے کیسے شوخ کو تفسیر کے بغیر

منطق سے فلسفہ سے دو موقف کا تم ثبوت
منزل کو کیسے پاؤگے تدبیر کے بغیر

مال و متاع سب چلے جائیں تو غم نہیں
سالم رہے گا کیسے تو توقیر کے بغیر

انجام عینیؔ وہ رہے علم عروض سے
تھا ان کا تبصرہ کسی تاثیر کے بغیر

سید خادم رسول عینیؔ
چیف منیجر، یونین بینک آف انڈیا، گومتی نگر، لکھنؤ
موبائل: 7506203515

غزل

کمان توڑ دی اپنی زرہ اتار چکا
خوشی مناؤ مرے دشمنو میں ہار چکا

اداس بیٹھی ہیں صحرا نوردیاں میری
میں اپنے آپ کو ہر دشت میں پکار چکا

میں قرضدار ہوں لوگوں مجھے ذلیل کرو
نہ قرض یار چکا اور نہ قرض دار چکا

بچا رکھا تھا جو اک تیر اس جہاں کے لئے
وہ ایک تیر میں سینے میں اپنے مار چکا

ہیں اور کام مجھے زندگی اجازت دے
میں تیری زلف پریشاں بہت سنوار چکا

کوئی حساب تھا تا عمر چک نہیں پایا
وہی حساب جو ہر روز بار بار چکا

امیر امام
نمبردار ہاؤس، نوریوں سرائے، سنبھل
موبائل: 8755593144

غزل

وہ آسماں ہے تو ہو میں زمین ہوں خوش ہوں
انا کے شہر میں جب سے مکین ہوں خوش ہوں

یہ جانتی ہوں کہ رہتے ہیں سانپ اس میں مگر
ابھی بھی پہنے وہی آستین ہوں خوش ہوں

خزاں کے دشت میں جشنِ بہار بھی ہوگا
نہ جانے کس لئے یوں پر یقین ہوں خوش ہوں

سنا ہے چھوڑ کے مجھ کو وہ کچھ اداس سا ہے
میں اس کی یاد کی اب تک امین ہوں خوش ہوں

زمانہ ظاہری صورت میں عیب ڈھونڈتا ہے
مجھے گماں ہے کہ دل سے حسین ہوں خوش ہوں

وہ آفتاب ہے چرچا ہے چار سو اس کا
میں اک چراغ ہوں گوشہ نشین ہوں خوش ہوں

درِ خدا کے سوا جو کبھی کہیں نہ جھکی
حنؔا ہے شکرِ خدا وہ جبین ہوں خوش ہوں

حنؔا رضوی حیدر
174-C، درگا دیوی مارگ، نزد مجنی پروا، حسین آباد، لکھنؤ
موبائل: 7800313410

غزل

درد ہونٹوں کے تبسم سے عیاں تک نہ ہوا
جل گیا خانۂ احساس دھواں تک نہ ہوا

سازشیں رچتے رہے قتل کی میرے مرے دوست
ہائے افسوس مجھے ان پہ گماں تک نہ ہوا

کر گیا مجھ کو یوں گمنام نشہ شہرت کا
بعد مرنے کے مرا نام و نشاں تک نہ ہوا

اس کو آداب محبت کے کوئی سکھلا دے
مرا محبوب مرا دشمنِ جاں تک نہ ہوا

زندگی نے تو کئے لاکھ ستم مجھ پہ مگر
ایک آنسو مری آنکھوں سے رواں تک نہ ہوا

خود کی دو گز کی زمیں اس کو میسر نہ ہوئی
مر گیا خانہ بدوش اپنا مکاں تک نہ ہوا

تری الفت تو بس اک حد میں ہی محدود رہی
تری خاطر یہ مرا عشق کہاں تک نہ ہوا

سید محمد عسکری عارف
ککھر کمال، سلطان گڑھ، امبیڈکر نگر
موبائل: 9005889955

غزل

فصل گل ایسی نہ تھی بادِ صبا ایسی نہ تھی
آج سے پہلے زمانے کی ہوا ایسی نہ تھی

یہ لباس گل بھی نظم گلستاں ایسا نہ تھا
سرخیٔ رنگ شفق بوئے حنا ایسی نہ تھی

مہرباں جس پر ہوئی اس کی بجھا دی تشنگی
میرے گھر پر جو برستی وہ گھٹا ایسی نہ تھی

آج ہم نے سچ کہا تو سب مخالف ہو گئے
ورنہ یہ دنیا کبھی ہم سے خفا ایسی نہ تھی

عبدالمنان صمدی
مکان نمبر 2939، ننگلہ ملاہ، کوئیل، علی گڑھ
موبائل: 9286300994

تعلیم وتربیت اطفال

مرزا جعفر حسین

۱۸۹۹ء ۱۹۸۹ء

'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان وشوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شاید ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِسموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہوگیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'

اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی تیرہویں کڑی کے طور پر **مرزا جعفر حسین** کی کتاب **'قدیم لکھنؤ کی آخری بہار'** سے ایک تحریر **'تعلیم وتربیت اطفال'** حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

رؤسا کے بچوں کی تربیت حقیقی معنوں میں اسی وقت سے شروع ہوجاتی تھی جب وہ اناکے آغوش میں مٹھیاں باندھنے، ٹانگیں اچھالنے اور قلقاریاں مارنے لگتے تھے اور جب وہ کھلائی کی گود میں ہواخوری کے لئے محل کے باہر لے جائے جاتے تھے۔ اناؤں اور کھلائیوں کو مامور کرنے کے قبل کئی دن تک اچھی طرح پر کھ لیا جاتا تھا اور یہ معائنہ گھر کی بڑی بوڑھیاں کیا کرتی تھیں۔ سب سے بڑی معلمہ مادرِ گرامی یعنی بیگم صاحبہ خود ہوتی تھیں۔ جن میں شرافت وانسانیت، مہر و مروت اور پاک بازی وفرض شناسی کے جوہر پیوست ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پرانے لکھنؤ کے رؤسا و عمائدین کم سے کم تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی کردار و شرافت کے مالک ہوتے تھے۔

دودھ پینے کے زمانے میں ان کو انگوٹھا بالخصوص پیر کا انگوٹھا چوسنے سے حکمت عملی کے ساتھ باز رکھا جاتا تھا۔ انا دودھ پلانے میں اس کا لحاظ رکھتی تھی کہ اتنی شکم پری نہ ہو کہ معدہ غذا اگل دے یا ہضم کرنے میں دیر لگائے۔ فطری جسمانی اخراجات میں پابندیٔ اوقات کی کوشش رہتی تھی اور بچے کے جسم پر غلاظت بھری رہنا قطعاً گوارہ نہیں ہوتا تھا۔ کھلائی یا دوا باہر نکلتی تو بچے کو ہر اس نظارے سے بصد ہزار اہتمام محفوظ رکھتی جو اخلاق سوز یا جمالیاتی مذاق کے منافی ہوتا۔ بچے کے رودینے پر انا اور ددا نیز چھوچھو سب بے قرار ہوجاتے تھے اور اس کے کمرہ میں بہت زور سے بات کرنا، چیخنا یا کسی کو ڈانٹنا سختی کے ساتھ ممنوع تھا۔

دودھ بڑھائی کے بعد ان توجہات پر اور زیادہ پابندی ہوتی تھی۔ نمک چشی کے بعد غذاؤں پر آمادہ کرنے کی فکر ہوجاتی اور ایک سال کی عمر تک پہنچ جانے کے بعد ہر ملازم خدمت گزار بات کرنا سکھاتی تھی۔ اس تعلیم میں مادر گرامی بھی شریک کار رہتی تھیں۔ نگرانی بھی فرماتیں اور خود بھی بات کرنا سکھاتی تھیں۔ سب سے بڑا رکھ رکھاؤ یہ تھا کہ محل کے اندر یا باہر بچے کے کان میں کوئی فحش کلمہ یا بدتہذیبی کی بات نہ پہنچ سکے۔ پرہیز اور احتیاط بچوں کی تربیت میں سب سے زیادہ اہم ضرورت تھی اور اسی ضرورت کو پورا کرکے بچے کو مہذب اور شائستہ بنادیا جاتا تھا۔

تربیت کا یہ طریقہ بھی قابل ذکر ہے کہ الفاظ یا عمل سے بچے کو کسی بات سے بھی ٹوکا یا روکا نہیں جاتا تھا بلکہ یہ فکر رہتی تھی کہ بچہ خود ہی کسی نامناسب یا غلط حرکت کی طرف آمادہ نہ ہو۔ یہی عدم آمادگی بلندیٔ کردار کا سنگ بنیاد ہوتی تھی۔

بچے کی عمر دو برس سے تجاوز کر جاتی تو اس کو کھانا کھلانے، اٹھنے بیٹھنے، سونے اور آرام کرنے کی عادات میں تربیت دی جاتی تھی۔ بہت دیر تک چت لیٹنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جاگتے یا سوتے میں دونوں ہاتھ سینہ پر آجانا یا ٹانگ پر ٹانگ دھر لینا بہت منحوس تھا۔ ان اطوار سے بچوں کو بچانے کے لئے ان کو بار بار کروٹیں دلا دی جاتی تھیں۔ یہ عادت ان کے خمیر میں اتنی راسخ ہوجاتی تھی کہ آخر عمر تک کروٹیں ہی لے کر محو خواب ہوتے تھے۔

اٹھنے بیٹھنے میں بھی بزرگوں کے عادات و اطوار
کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چھوچھو یا ددا سہارا دے کر اٹھاتی
اور بٹھاتی، انگلی پکڑ کر کھڑا کرتی اور ٹہلاتی تھی، زور سے
دوڑنے کا کوئی موقع ہی فراہم نہیں ہونے پاتا تھا۔
چھوچھو کا یہ فرض عین تھا کہ وہ ہر وقت بچے کے ہاتھ
پاؤں، سر اور چہرہ صاف و شفاف اور ہمہ وقت اجلے
کپڑوں میں ملبوس رکھے۔ چھوچھو کی اس ریاضت سے
بچہ خود صفائی اور پاکیزگی کا خوگر ہوجاتا تھا اور جب بھی
جسم کے کسی حصے پر میل آجاتا یا کپڑے پر غبار آجاتا تو
وہ اپنی جبلی خصلت کے تحت اس طرف انگلی سے
اشارے کر کے دوسروں کو متوجہ کر دیتا تھا۔

فی زمانناً دودھ پیتے بچوں میں ایسے خصائل کا
موجود ہونا لوگوں کو باور نہ ہوگا لیکن راقم کے خاندان
میں دو برس کے کم کی عمر کے شیر خوار بچوں میں ایسی دو
مثالیں آج بھی موجود ہیں۔ انہیں دو بچوں میں غذاؤں
کے پرانے اطوار بھی ملتے ہیں۔ کھلائی اور چھوچھو تمیز
سے گود میں لے کر یا بٹھا کر صاف چینی کے خوشنما
برتنوں میں کھانا کھلاتی تھی۔ یہ غذائیں عموماً کھیر یا
کھچڑی ہوتی تھیں۔ فیض تربیت سے یہ نونہال ایک
نوالہ بھی فطری ضرورت سے زیادہ منھ میں رکھنا قبول
نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح کھچڑی کی پلیٹ میں اگر
اتفاقاً کوئی لونگ، جس سے کھچڑی بگھاری جاتی تھی، نظر
آجاتی تو بچہ کھانا کھانے سے فی الفور انکار کر دیتا تھا۔
پھول دار اصلی چینی کی پلیٹوں میں روسا کے کھانا کھانے
کا عام رواج تھا۔

فلاکت منڈلانے کے بعد بھی ایرانی مٹی کے
بنے ہوئے مصنوعی ظروف استعمال ہوتے تھے۔ ان
میں بھی رنگینی، چمک دمک، رنگ روغن، نفاست و
لطافت اور جاذبیت اصلی چینی سے مشابہ ہوتی تھی۔ بچے کو
زیادہ سے زیادہ رنگین، پھول دار اور خوش نما پلیٹ میں
کھانا کھلایا جاتا تھا۔ سادہ اور سفید برتن میں کھانا دینا
انتہائی بدتہذیبی تھی۔ اس تمام تربیت میں انا، کھلائی، ددا
اور چھوچھو کا حصہ تھا اور بیگم کی نگرانی بھی شامل حال رہتی
تھی۔ وہ ہر مناسب موقع اور محل پر باہر تشریف لا کے
وقتاً فوقتاً معائنہ فرمالیا کرتی تھیں اور ضرورت ہوتی تو
ہدایات جاری کرتی تھیں جن کی تعمیل ہر ملازمہ بدل و
جان کرتی تھی۔

بعض خاندان میں تیسرے برس اور کہیں
پانچویں برس بچوں کی خواہ لڑکا ہو یا لڑکی رسم بسم اللہ ادا
ہوتی تھی۔ اعزا و اقارب، دوستوں اور ملازموں کے
مجمع میں کوئی عالم دین بسم اللہ پڑھا کے قرآن مجید کے
سورۂ 'اقرأ باسم' کی پہلی آیت بچے کی زبان پر وارد کرتا
تھا۔ اس کے بعد لڑکی کو گھر کی استانی اور لڑکے کو باہر کے
معلم کو تعلیم کی خاطر سپرد کر دیا جاتا تھا لیکن لکھنؤ کے
پرانے کلچر کی اصلی بنیاد تہذیب و شائستگی، شرافت و
انسانیت، رواداری و پاسداری، حسن سلوک اور مراعات
اور رئیسوں کے تزک و احتشام پر قائم تھی۔ ان بنیادی
محاسن کردار و اطوار میں تعلیم سے زیادہ تربیت ضروری
تھی اور یہ تربیت سن شعور آجانے تک بچے کی مخصوص
ملازماؤں اور اس سے کہیں زیادہ والدین کے ذمہ رہا
کرتی تھی۔ محل کے اندر والدۂ محترمہ ہر معاملہ میں
پاکیزگی اور محترم درس دیتی تھیں اور بیرونی نشست گاہ
میں یہ فریضہ پدر عالی مقدار ادا کرتے تھے۔ بسم اللہ
ہوجانے کے بعد کھلائی کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ لڑکے کو
نواب کے حضور کسی نہ کسی وقت ضرور لے جا کر بٹھا
دے۔ اس شرف حضوری کے حاصل کرنے میں
طوائف کی موجودگی، رقص و سرود کی بزم یا بے تکلف
دوستوں کی بے تکلفانہ گفتگو کوئی امر حارج نہیں ہوتا
تھا۔ نئی روشنی کا چراغ جلنے کے بعد اگر کوئی حاضر الوقت
نواب کے لڑکے کو ایسی صحبتوں میں بٹھائے رکھنے پر
اعتراض کرتا تو فی الفور جواب ملتا کہ اپنی اولاد کو ہر
شعبۂ حیات میں سبق دینے اور اس کو زندگی کی ہر شاہراہ
میں صحیح راستہ پر چلنا سکھانے کا فریضہ پروردگار عالم
نے مجھ پر عائد کیا ہے۔ اس طرز عمل کا یہ نتیجہ تھا کہ
لڑکے اپنی اپنی جبلی صلاحیتوں کے تحت زندہ رہنے اور
اچھی زندگی گزانے کا سبق لینے یا خود اپنی فطری
کمزوریوں میں گرفتار ہوکر خراب ہوجاتے تھے۔
چنانچہ ایسی مثالیں کثرت سے ملتی تھیں کہ طوائف باز
رئیسوں کے بچے بڑے ہوکر ثقہ اور معصوم صفت بن
جاتے تھے۔ بعض ایسے بھی نکلتے تھے جو تنعم اور عیش
پرستی میں اپنے بزرگوں کا چھوڑا ہوا کثیر سرمایہ قلیل سے
قلیل تر مدت میں تباہ و برباد کر دیتے تھے۔

راقم اس خیال کا حامل ہے کہ یہ بدکرداری
بزرگوں کے آزادانہ رکھ رکھاؤ کی وجہ سے نہیں پیدا
ہوئی تھی بلکہ ان کی تباہی میں اس زمانہ کے عام ماحول کا
اثر شامل تھا۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لڑکے مردانگی
نشست گاہ میں بیٹھ کر تعیش و تنعم کے مظاہروں سے کبھی
کوئی خراب اثر قبول ہی نہیں کرتے رہے ہوں گے
لیکن ان کی اپنے پدر عالی مقدار کی بارگاہ میں موجودگی
بمقابلہ خراب اثرات کے اچھے عادات و اطوار سیکھنے
میں زیادہ ممد و معاون ہوتی تھی۔

خوش کرداری اور خوش اطواری کی تربیت
والدین کس طرح دیتے تھے، یہ تذکرہ بھی دلچسپی سے
خالی نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں راقم وہی واقعات پیش
کرنا چاہتا ہے جو عہد طفولیت میں خود اس پر گزرے
تھے اور جنہوں نے پتھر کی لکیر کی طرح حافظہ پر اثر
ڈالا تھا۔ والدہ مرحومہ کا طرز تربیت یہ تھا کہ وہ پاس بٹھا
کر کچھ سوالات کرتی تھیں جن کے جوابات سے وہ کوئی
نہ کوئی موضوع ٹٹول کر نکال لیتی تھیں۔ پھر اسی موضوع
پر ایک طویل گفتگو فرماتیں یعنی ایک لکچر دیتی تھیں۔ ان
کا طرز دل پذیر ہوتا تھا جس میں شفقت مادری بھی
شامل ہوتی تھی۔ اس لئے ان کی لمبی سے لمبی تقریر میں
بھی دل نہیں گھبراتا تھا۔ دوران تقریر وہ متعدد
احادیث اور آیات قرآنی پڑھ کر سناتی تھیں۔ پھر ان کا
ترجمہ کر کے مطلب سمجھاتی تھیں۔ مختصر یہ کہ موضوع
سخن سے جن باتوں کو دور کا بھی لگاؤ ہوتا وہ سب ان

کے بیان میں آجاتی تھیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کا یہ فیض تھا کہ میں نے اپنی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق پہلا کارآمد درس انہیں سے سیکھ لیا تھا۔ اس مقام پر صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ والد مرحوم کے ایک دوست پنڈت اننت رام کٹر مذہبی انسان تھے لیکن خلوص و محبت کا مجسمہ تھے۔ والد مرحوم بھی بہت مذہبی تھے اور غیر مسلمین کے ہاتھ کی کوئی تر چیز قبول نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح پنڈت اننت رام ہمارے گھر کا نہ پان کھاتے اور نہ پانی پیتے تھے لیکن ہمارے درمیان اتنی قربت تھی کہ میں ان کو چچا کہتا اور وہ میرے اوپر حقیقی چچا کی طرح شفیق تھے۔ جاڑے کا موسم تھا۔ میرا سن چھ یا سات برس کا تھا اور میں نزلہ میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے ناک سے کچھ ریزش ہوئی۔ پنڈت جی نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور میری ناک صاف کر کے اس کو پھر جیب میں رکھ لیا۔ ان کی یہ حرکت میرے دل و دماغ کو باوجود صغر سنی کے متاثر کر گئی۔ نوالہ منہ میں تھا اور میں ہاتھوں نیز چشم و ابرو سے کچھ اشارے کر رہا تھا۔ دفعتاً والدہ محترمہ تشریف لے آئیں۔ دور سے وہ میری اشارہ بازیاں ملاحظہ کر چکی تھیں۔ کچھ وقفہ توقف فرما کے اور ادھر ادھر دیکھ بھال کر کے انہوں نے میرے خیالات کا جائزہ لیا۔ میری تربیت کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ میں ان سے بلا تکلف ہر بات صحیح صحیح کہہ دیتا تھا اور طبیعت میں کوئی جھجک نہیں پیدا ہوتی تھی۔ اس موقع پر بھی میں نے سارا واقعہ ان کو سنا دیا اور یہ سوال کیا کہ 'کیا ہماری ناک پاک ہے؟' وہ مسکرائیں اور میں نے ان کے پوچھے بغیر اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ چچا ہمارے گھر کا پانی نہیں پیتے، پان نہیں کھاتے، ہمارے گھر کی ہر چیز کو نجس سمجھتے ہیں لیکن ہماری ناک کو انہوں نے نجس نہیں سمجھا، اپنا ہاتھ اور اپنا رومال خراب کیا اور اس رومال کو پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

محترمہ کے طویل جواب کا ملخص یہ تھا:

'تم بھی تو ان کے یہاں کی کوئی چیز نہ کھاتے اور نہ پیتے ہو تو کیا اس پرہیز کی وجہ سے وہ تمہارے چچا نہیں رہے۔ باوجود اس طرزِ عمل کے وہ تمہارے چچا ہیں اور تم ان کے بھتیجے ہو۔ یہ رشتہ انسانیت کی بنیاد پر استوار ہے۔ اس رشتہ کے علاوہ بالکل علیحدہ نوعیت پر ایک دوسرا رشتہ جو انسانیت میں خلل انداز نہیں ہوتا مختلف مذاہب نے خدا اور بندوں کے درمیان قائم کیا ہے۔ مذہب نے زندگی کے علیحدہ علیحدہ طرز ضرور قائم کئے ہیں جن کی پابندی کرتے ہوئے تم ان کے یہاں اور وہ تمہارے یہاں کچھ نہ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں لیکن مذہب کی کوئی طرز انسانی برادری میں حد فاصل قائم نہیں کرتی۔ وہ اپنے دھرم پر ہیں اور تم اپنے مذہب کے پابند ہو لیکن اس کے باوجود وہ چچا ہیں اور تم بھتیجے اور کوئی مذہبی تفریق تم کو ان سے یا ان کو تم سے جدا نہیں کر سکتی۔ یہ عزیزدارانہ تعلق اتنا ہی فطری ہے جتنا مذہب کی تعلیم پر عمل کرنا برحق ہے۔'

والدہ محترمہ نے اپنے ان اقوال کی تائید میں متعدد آیات و احادیث کو استدلال میں پیش کیا تھا اور اپنا نکتۂ خیال میرے ذہن میں اتنا راسخ کر دیا تھا کہ وہی درس میری سیاسی زندگی میں میرے لئے مشعل راہ بنا رہا۔

❑❑❑

قصیدہ خالص عربی صنف ہونے کے باوجود فارسی ادب میں زبردست مقبول ہوئی۔ فارسی میں رودکی، منوچہری، ناصر خسرو، خاقانی، انوری، شیخ سعدی اور عرفی شیرازی جیسے شعراء نے قصیدے کی مقبولیت کو دوبالا کر دیا۔ اردو ادب نے فارسی سے ہی قصیدہ کو مستعار لیا۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی نے اردو قصیدہ کی داغ بیل ڈالی۔ شمالی ہند میں سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ اور اس کے بعد منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی جیسے شعراء نے قصیدہ گوئی میں اپنا نام پیدا کیا۔ دور حاضر میں گمان غالب ہے کہ یہ صنف بحرانی دور سے گزر رہی ہے حالانکہ کولکاتا، حیدرآباد، امروہہ، الہ آباد، فیض آباد، لکھنؤ اور بہار کے کچھ شہروں میں چند شعراء قصیدہ کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اردو علم و ادب کے حلقوں میں قصیدہ کے تئیں نئی نسل کا رجحان کمیاب ہے۔ ادارہ 'نیا دور' بہت جلد قصیدہ کے فن، روایت اور تاریخ پر ایک شمارہ شائع کرے گا۔ قلمی تعاون درکار ہے۔ **(ایڈیٹر)**

پنجہ خانہ

کیتو وشوناتھ ریڈی

رنگسائی پورم، بیر انگلل، آندھرا پردیش

ہرے بھرے نیم کے درخت کے سامنے پرانے زمانے کا پنجہ خانہ تھا۔ دیواروں پر جا بہ جا پپڑی اکھڑ گئی تھی۔ پیروں کے جشن کے وقت لیپے پوتے گئے چونے کی سفیدی میلی پڑ گئی تھی۔ چھت پر لگے شہتیروں میں دیمک لگ گئے تھے۔ وہ کھوکھلے ہوتے جا رہے تھے۔ شہتیروں پر دوڑ لگاتے چوہوں کی وجہ سے لونی مٹی رہ رہ کر گر رہی تھی۔ شہتیر آج یا کل گرنے ہی والے تھے۔ ان شہتیروں میں دو مضبوط شہتیروں سے پیروں کا صندوق لٹک رہا تھا۔ اس صندوق میں چھوٹے بڑے پنجے اگلے محرم کی آمد کا انتظار کر رہے تھے جو صرف محرم کے دنوں میں ہی چمک دمک کے ساتھ لہکتے انگاروں پر چلے تھے، جلوس میں شان کے ساتھ نکلے تھے۔

ٹھیک اس صندوق کے نیچے تھوڑا ہٹ کر، ایک ڈھیلی پڑی جھولے جیسی لٹکتی ہوئی چار پائی پڑی ہوئی تھی جس پر مستان اکیلا بیٹھا ہوا بانی میں لڑنے کے لئے تیار مرغے کو دانہ کھلا رہا تھا۔

اس مرغے کی ٹانگوں اور پروں کو اپنی رانوں کے نیچے دبا کر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اس کی چونچ کو کھول کر پکڑے ہوئے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں ہری جوندھری (جوار) اور مونگوں کو لے کر دھیرے دھیرے بڑی احتیاط سے کھلا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی دھیان رکھا تھا کہ کہیں وہ دانے چھٹک کر نیچے نہ گر جائیں۔ اس ستلی کی پلنگ کے سوراخوں میں جستے کے لوٹے کو اٹکا کر اس میں پانی بھر رکھا تھا۔ رہ رہ کر مرغے کے منھ میں دو تین گھونٹ پانی ڈالتا جاتا تھا۔

مرغے نے پانی پی کر گردن کو تھوڑا اچھلایا۔ مرغے کے گردن کو سہلاتے ہوئے ایک بار پنجہ خانہ کو چاروں طرف دیکھا پھر اپنے آپ بولنے لگا۔ ''میرے یار! اب کی دنگل میں مرغے بازی میں اپنے مد مقابل مرغوں کو شکست دے کر اس کی اکڑ کو مٹا دینا ہوگا۔ ایسی چالیس چلنا کی بازی جیت لیں! اگر بازی جیت جاؤ گے تو تمہیں نیا جھکا بنوا کر پہناؤں گا۔ اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو پنجہ خانے کی کم سے کم اس سال مرمت کرواؤں گا۔ بڑی بازی جیت جاؤ گے تو نیا پیر بنواؤں گا۔ خوب کھاؤ رے.... میرے یار....''

> تیلگو زبان کے معروف ادیب اور افسانہ نویس اور مترجم کیتو وشوناتھ ریڈی کے ۳۶ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔
>
> ان کی کہانیوں کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ متعدد ادبی اعزازات سے بھی نوازے جاچکے ہیں۔
>
> پیش ہے ان کی کہانی **'پنجہ خانہ'** جس کا اردو ترجمہ **'فاضل احسن ہاشمی'** نے کیا ہے۔

مستان نے مرغے کی چونچ کو پھر کھول کر پاس ہی رکھے سوپ سے مٹھی بھر دانے کو لے کر بھر دیا۔ اس نے پنجہ خانے کے سامنے موجود نیم کے پیڑ کی نیچے کھڑے سرپنچ اشوتھیہ ریڈی اور اس کے ساتھ آئے چار پانچ لوگوں کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

''چناؤ کے دنوں میں ہرا یرے غیرے نتھو خیرے کے پاس چکر لگانا پڑتا ہے۔'' کہہ کر دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے اشوتھیہ ریڈی نے بناوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے بہت ہی عزت کے ساتھ مستان سے پہل کی۔ ڈھیلی جھولتی سے چار پائی پر پھٹی پرانی بنیان اور لنگی پہنے بیٹھا ہوا مستان پیر کی طرح اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا۔ یکایک ہاتھ کی پکڑ سے چھوٹ کر پر پھڑ پھڑاتا ہوا مرغا دانے والے کالے سوپ پر اچھل کر، پنجوں کے صندوق پر جا بیٹھا اور بانگ دینے لگا۔

آٹھ آنہ (یعنی ۵۰ پیسے کا سکہ) کے دانوں کا زمین پر گرنے کی وجہ سے مستان کو مرغے پر غصہ آ رہا تھا۔

''بازی لڑنے والے مرغوں کو مستان کے سوا اور کوئی نہیں پال سکتا ہے۔'' اشوتھ ریڈی کی تعریف سن کر مستان کا غصہ غائب ہو گیا۔ وہ دوڑتے ہوئے اپنی مٹی کی جھونپڑی میں گیا اور ایک چادر نما گدڑی لا کر اسے ڈھیلی چار پائی پر بچھا دیا۔ مستان نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''تشریف رکھئے!''

وہاں آئے کسی نے بھی اس چار پائی پر بیٹھنے کی ہمت نہیں کی۔ ''اتنے لوگوں کو چار پائی پر بٹھاؤ گے تو کام کیسے چلے گا؟'' ان میں سے کسی نے طعنہ مارا۔

ان میں سے ایک نے اس کی تعریف میں پل باندھتے ہوئے کہا۔ '' جو بھی ہو مسلمانوں کی طرح خاطر داری کرنا ہم کاپو ذات والوں کو نہیں آتا ہے۔''

''اس کے ابا جان بوڈین صاب کے زمانے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ان کی خاطر داری سے بمبئی کے سیٹھ بھی دانتوں تلے انگلی دبا لیا کرتے تھے۔

انتون چیخوف

۱۸۶۰ ۱۹۰۴

اذیت

انتون چیخوف افسانہ نگاری کی تاریخ کی ایک عظیم شخصیت تصور کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے بے شمار کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔ ان کی تحریریں انسانی مزاج کی غماز ہیں۔ ان کی کہانیاں اور ڈرامے روسی انقلاب سے قبل کے سماج کا بہترین عکس پیش کرتی ہیں۔ ان کے کردار ترقی پسندی کی مثالیں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان میں چیخوف کی کہانیوں کے ترجمے بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

پیش ہے انتون چیخوف کی کہانی 'اذیت' جس کا اردو ترجمہ **'گل جبین اختر'** نے کیا ہے۔

مستری گریگوری پیترو، جسے پچھلے کئی سالوں سے گال چینسکوی ضلع کے لوگ ایک ماہر دستکار کے ساتھ ساتھ ایک کاہل کسان کے طور پر جانتے تھے، اپنی بوڑھی بیوی کو اسپتال لے جا رہا تھا، اسے گاڑی ہانک کر تقریباً ۲۰ میل کا سفر طے کرنا تھا اور سڑک بہت زیادہ خراب تھی، جس پر گاڑی ہانکنا گریگوری جیسے کاہل تو کیا سرکاری ڈاکئے تک کے بس کے باہر کی بات تھی۔ جما دینے والی ٹھنڈی ہوا سیدھے اسکے چہرے پر لگ رہی تھی، برف کے گالے ہوا میں چاروں طرف گول گول اڑ رہے تھے۔ بتانا مشکل تھا کہ برف آسمان سے گر رہی ہے یا زمین سے۔ برف کے دھوئیں کی وجہ سے کھیت، تار کے کھمبے اور جنگل کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے اور جب تیز ہوا کا تھپیڑا گریگوری کو لگتا تو اسے گھوڑے کا جوا بھی نظر نہ آتا۔ بوڑھی، ناتواں، گھوڑی رینگ رینگ کر چل رہی تھی۔ برف کے ڈھیر سے ایک ایک قدم نکالنے اور گردن جھٹکے سے کھینچنے میں ہی اسے ساری طاقت لگانی پڑتی تھی۔ مستری کو جلدی تھی۔۔۔ وہ بے چینی سے بار بار اپنی سیٹ سے کود کر اٹھتا۔ بیٹھتا اور گھوڑی کی پیٹھ پر چابک مارتا۔

'رومت میتروناؔ' وہ بڑبڑیا۔

تھوڑا صبر رکھو، خدا کرے ہم جلدی سے اسپتال پہنچ جایں اور پل بھر میں سب ٹھیک ہو جائیگا۔ پاویل ایوانچ تمھیں کچھ دوا دیں گے یا تمہاری فصد کھول کر خون نکالنے کو کہیں گے یا ہوسکتا ہے بھلائی میں تمہارے جسم پر سپرٹ کی مالش کروا دیں، سپرٹ تمھارے جسم کا درد کھینچ لے گی، پاویل ایوانچ اپنی بھرپور کوشش کریں گے، وہ چلایں گے، پیر پٹکیں گے لیکن وہ تمھارے لیے اپنی پوری کوشش کریں گے۔ وہ بہت نیک اور ملنسار آدمی ہیں، خدا انھیں لمبی عمر عطا کرے! دیکھنا ہم لوگ جیسے ہی وہاں پہنچیں گے وہ بھاگ کر اپنے کمرے سے باہر آ جایں گے اور مجھ پر برسنا شروع کر دیں گے، 'کیسے؟ کیوں؟' وہ چیخیں گے' تم وقت پر کیوں نہیں آئے؟ میں کوئی کتا نہیں ہوں جو تم شیطانوں کے اشاروں پر ناچتا رہوں، تم صبح کیوں نہیں آئے؟ بھاگ جاؤ! دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ اب کل آنا! اور میں کہوں گا ڈاکٹر صاحب! پاویل ایوانچ! مائی باپ۔۔۔!

جلدی چل شیطان گھوڑی! تجھے ہیضہ ہو جلدی چل!'

مستری نے گھوڑی کو چابک لگایا اور بیوی کی طرف دیکھے بغیر بڑبڑاتا گیا۔

'جناب! خدا گواہ ہے۔۔۔ میں پاک صلیب کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میں علی الصبح ہی گھر سے روانا ہو گیا تھا، میں یہاں وقت سے کیسے پہنچ پاتا، ماں مریم نے بہت غصے میں یہ برفیلہ طوفان برپا کر دیا۔ مہربانی کر کے آپ خود دیکھ لیں، کوئی عمدہ قسم کا گھوڑا بھی یہاں وقت پر نہیں پہنچ سکتا تھا جبکہ میری گھوڑی آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ گھوڑے کے نام پر داغ ہے، اور پاویل ایوانچ تیوریاں چڑھا کر چلائیگا،' میں تم لوگوں کو جانتا ہوں، تم لوگ ہمیشہ کوئی نا کوئی بہانہ تلاش کار ہی لوگے! خاص طور پر تم گریشکا، تمہیں تو میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں، میرے خیال سے تم راستے میں آدھا درجن شراب خانوں پر رکے ہوگے!' اور میں کہوں گا، 'جناب کیا میں کوئی سنگ دل یا کافر ہوں؟ میری بیوی مجھے چھوڑ کر خدا کے پاس جانے کی تیاری میں ہے، وہ مر رہی ہے اور میں شراب خانوں کے پیچھے بھاگوں گا، یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں، جہنم میں جایں شراب خانے! تب پاویل ایوانچ تمھیں اسپتال کے اندر لانے کی اجازت دیں گے اور میں ان کے پیروں میں گر جاوں گا،' پاویل ایوانچ، حضور ہم تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں! ہماری بیوقوفیوں اور غلطیوں کو معاف کریں، ہم کسانوں کی طرف اتنا

سنگدل نہ ہوں، آپ ہمیں لات مار کر نکال دیں، ہم اسی کے حقدار ہیں۔ جبکہ آپ رحم کر کے ہم سے ملنے باہر برف میں نکل آئے ہیں!' پاویل ایوانچ مجھے ایسے دیکھیں گے جیسے اب وہ مجھے ماریں گے اور کہیں گے، 'زیادہ اچھا ہو شراب پینا بند کر بیوقوف اور میرے پیروں میں گرنے کے بجائے اپنی بیوی پر رحم کر۔ تمہارے تو کوڑے لگنے چاہئے!' آپ سہی کہہ رہے ہیں، کوڑے پاویل ایوانچ! خدا جانتا ہے، لیکن ہم آپکے پیروں میں کیسے نہ گریں جبکہ آپ ہمارے خیر خواہ ہیں اور ہمارے اصلی باپ! حضور میں خدا کے سامنے قسم کھاتا ہوں، آپ میرے منہ پر تھوک دینا اگر میں اپنی بات سے پھر جاوں، جیسے ہی میری میتر ونا ٹھیک ہو جائیگی، پہلے جیسی صحتمند اور اچھی حالت میں، آپ جو حکم دینے کی مہربانی کریں گے میں حضور کے لیئے بنا کر دوں گا! سگریٹ کیس، اگر آپکو پسند ہو تو، صنوبر کی عمدہ لکڑی کا سگریٹ کیس۔۔۔۔کراک ویٹ کھیلنے کے لیئے گیند۔۔۔ لکڑی کی بوتلیں غیر ملکی قسم کی۔۔۔ میں آپکے لیئے کچھ بھی بناوں گا اور اسکے لیئے میں آپ سے پینی کا چوتھائی بھی نہ لوں گا، ماسکو میں ایسے سگریٹ کیس کے لئے لوگ آپسے چار روبل اینٹھتے، لیکن میں آپ سے ایک کوپک بھی نہیں لوں گا' ڈاکٹر ہنس کر کہے گا، 'اچھا ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔۔۔، بس کر بہت ہوا، لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ تم شرابی ہو۔۔' ان بھلے لوگوں سے بات کرنا مجھے آتا ہے بوڑھی عورت، ایسا کوئی بھلا مانس نہیں ہے جسے میں اپنی باتوں سے منا نا لوں، بس خدا ہم پر اتنا رحم کرے کہ ہم راستہ نہ بھولیں۔ آہ، کیسا طوفان ہے، برف کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا"۔۔

مستری برابر بڑبڑاتا جاتا۔ اپنی بے قراری چھپانے کے لئے وہ لگاتار رکارڈ کی طرح بکبک کرتا جاتا۔ اسکی زبان پر الفاظ کی کمی نہیں تھی مگر ذہن میں اٹھنے والے خیالات اور سوالات کا کوئی خاتمہ نہیں تھا، اذیت نے ناگہاں اسے گھیر لیا، اچانک اور غیر متوقع طور پر وہ غموں میں ڈوب گیا تھا اور اب وہ خود کو اس دکھ سے باہر نہیں نکال پا رہا تھا۔ اسکے اوسان خطا ہو گئے تھے، ابھی تک اسنے لا پرواہی کی زندگی گزاری تھی مانوں شراب کی خماری میں، خوشی اور غم کا اسے کچھ اندازہ ہی نہیں تھا اور اب اچانک اسے سینے میں ایک نا قابل برداشت درد محسوس ہونے لگا تھا۔ لا پرواہ، کاہل، شرابی دفعتاً اپنے آپ کو کام میں مصروف اور فکرو جلد بازی میں خود کو قدرت سے جوجھتا ہوا پا رہا تھا۔

مستری نے یاد کیا کہ یہ مسئلہ پچھلی شام کو شروع ہوا تھا جب وہ ہمیشہ کی طرح پی کر شام کو گھر لوٹا اور اپنی برسوں پرانی عادت کے مطابق گالی بکنے اور گھونسے چلانے لگا، اسکی بوڑھی عورت نے اپنے ظالم شوہر کو ایسی نگاہ سے دیکھا جیسے اسنے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، عام طور پر اسکی بوڑھی آنکھوں میں قربانی، ڈرپوک بالکل ایسے کتے کی طرح جو برابر پیٹا جاتا ہو اور بہت کم کھانے کو ملتا ہو۔ مگر اس وقت وہ اسکی آنکھیں ساکن اور ساکت تھیں جیسے سنتوں کی مجسموں کی آنکھیں ہوتی ہیں یا بستر مرگ پر پڑے انسان کی۔ ان تکلیف زدہ آنکھوں نے مستری کے دل میں اذیت کا بیج بویا تھا، حواس باختہ مستری پڑوسی سے گھوڑی مانگ کر لایا تھا اور اس امید کے ساتھ اسپتال لے جا رہا تھا کہ پاویل ایوانچ اپنے چورن اور ملہم کی مدد سے بوڑھیا کی آنکھوں میں پہلے والی جھلک لا دیگا۔

سنو میتر ونا!" وہ بولا۔

اگر پاویل ایوانچ تم سے پوچھیں کیا میں تمہیں پیٹتا ہوں، تم کہنا 'نہیں صاحب' اور میں تم پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھاوں گا، میں قسم کھا کر کہتا ہوں اور کیا میں نے کبھی کسی عداوت میں تجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے،؟ میں تو بس بنا سوچے بنا کسی وجہ کے ہاتھ اٹھاتا تھا۔ مجھے تو تجھ پر رحم آتا تھا، اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو پریشان ہوتا مگر میں تو تجھے اسپتال لے جا رہا ہوں۔۔۔ اور اپنی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں اس طوفان میں جہاں ہر طرف برف ہے۔ خدا تیرا شکر ہے! بس ہمیں راستہ نہ بھولنے دینا۔ میتر ونا اب تمھارے بغل کا درد کیسا ہے؟ تم کچھ بولتی کیوں نہیں میتر ونا،؟ میں نے پوچھا تمھاری بغل کا درد کیسا ہے؟"

اسے تعجب ہو رہا تھا کہ بوڑھیا کے چہرے کی برف پگھل نہیں رہی تھی، عجیب بات یہ تھی کہ اسکا چہرہ بھی لمبوترا اور کھنچا ہوا لگ رہا تھا، اور ایسے پھیکا بھورے رنگ کا ہو رہا تھا مانو گندی موم، سنجیدہ اور سخت لگ رہا تھا۔

'اے پاگل بوڑھیا!' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، میں خدا کو حاظر ناظر جان کر تجھے ایمانداری سے بتا رہا ہوں اور تو۔۔۔۔ پوری بیوقوف ہے، جا میں تجھے پاویل ایوانچ کے پاس نہیں لے جاوں گا۔'

مستری نے لگام چڑھائی اور سوچنے میں لگ گیا، بوڑھیا کی طرف دیکھنے کی اسکی ہمت نہیں ہو رہی تھی، وہ ڈرا ہوا تھا اور بغیر جواب ملے سوال کرتے جانے سے بھی وہ ڈر رہا تھا، آخر کار اپنی پش و پیش دور کرنے کی غرض سے اس نے بوڑھیا کی طرف دیکھے بغیر اسکا ٹھنڈا ہاتھ محسوس کیا اور گہری مایوسی سے ہاتھ چھوٹ گیا!

ہائے مرگئی، یہ کیا ہو گیا"

اور مستری رونے لگا۔ اسے افسوس سے زیادہ جھنجلاہٹ ہو رہی تھی، وہ سوچنے لگا کہ دنیا میں سب کچھ کتنی جلدی گزر جاتا ہے، اسکی یہ پشیمانی ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ سب کچھ ختم ہو گیا، مرنے سے پہلے اسے اپنی بیوی کے ساتھ رہنے، اپنا ملال دکھانے کا بھی وقت نہیں مل پایا۔ وہ اسکے ساتھ ۴۰ سال رہا، مگر وہ ۴۰ سال ایک غبار کی طرح گزر گئے۔ شراب پینے، لڑنے جھگڑنے اور غریبی میں کہ زندگی کا احساس ہی نہیں رہا۔ بوڑھیا ٹھیک اس وقت گزر گئی جب اسے احساس ہوا کہ اسکے لئے اسکے دل میں ملال ہے کہ وہ

اسکے بنا نہی رہ سکتا اور اسنے اسکے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا۔

وہ گاؤں کے چکر لگانے جاتی تھی" اسے یاد آیا، میں خود اسے روٹی کے لئے بھیک مانگنے بھیجا کرتا تھا.. آہ یہ کیا ہو گیا! وہ ابھی ۱۰ سال تک اور زندہ رہ سکتی تھی، بیچاری! وہ سوچتی ہوگی کہ میں سچ میں ایسا آدمی تھا، پاک ماں! لیکن میں کہاں جا رہا ہوں؟ اب اسے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، بلکہ قبر کی ضرورت ہے.. اب مڑ جاؤ"

گریگوری نے لگام کھینچ کر گھوڑی کا منہ پیچھے گھمایا اور اپنی پوری طاقت سے اسے چابک جمائی۔ سڑک ہر گھنٹے بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ اب اسے گھوڑی کا جوا تک نظر نہیں آ رہا تھا، گاڑی کبھی کبھی صنوبر کے درختوں کو کچلتی ہوئی نکل جاتی تھی، کوئی کالی چیز مستری کا ہاتھ رگڑتی اسکی آنکھیں چندھیا جاتی اور تھپیڑے مار کر نکل جاتی، نظروں کے سامنے سفیدی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسے یاد آیا کہ آج سے ۴۰ سال پہلے میتروِنا جوان، خوبصورت اور خوش دل تھی۔ وہ ایک اچھے خاندان سے آئی تھی، اسکی شادی گریگوری سے اسکی دستکاری میں مہارت کی وجہ سے کی گئی تھی، خوشحال زندگی کی تمام آسائشیں موجود تھیں، مگر شادی کے فوراً بعد ہی شراب کے نشے میں وہ چولہے کی کگار پر ٹانگیں پھیلا کر سو گیا تھا اور اب تک وہ پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا۔

اسے شادی یاد تھی مگر شادی کے بعد کیا ہوا اسے کچھ یاد نہیں تھا، سوائے شراب پینے، چولہے کی کگار پر لیٹنے اور جھگڑا کرنے کے۔ عمر کے ۴۰ سال اسی طرح تباہ ہو گئے تھے۔

سفید برف کے بادل دھیرے دھیرے بھورے ہو رہے تھے۔ شام ہو چلی تھی۔

میں کہاں جا رہا ہوں"؟ دفعتاً مستری نے خود سے پوچھا، مجھے اسکی تدفین کے بارے میں سوچنا چاہئے اور میں اسپتال جا رہا ہوں، مانو میں پاگل گیا ہوں"

گریگوری پھر پیچھے گھوما اور گھوڑی کو چابک لگایا۔

چھوٹی گھوڑی نے پوری طاقت لگائی اور پھنکار کر دلکی چال چلنے لگی۔ مستری اسے برابر چابک مارتا جاتا۔ اسے اپنے پیچھے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پیچھے مڑے بغیر اس نے اندازہ لگایا کہ لاش کا سر گاڑی سے ٹکرا رہا ہے۔ رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی، ہوا اور بھی ٹھنڈی اور ٹھٹھرن بھری ہوتی گئی۔

"کاش زندگی دوبارہ شروع کرنے کو مل پاتی" مستری سوچنے لگا، "میں نئی خراد خریدوں، اس سے سامان بناؤں، نئے آرڈر لیں اور سارا پیسہ اپنی بوڑھیا کو دوں"۔

اور اسکے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی، وہ اسے تلاش کرنے لگا، اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر اسکے ہاتھ کام نہیں کر رہے تھے۔

کوئی بات نہیں، اسنے سوچا، گھوڑی اپنے آپ چلے گی، وہ راستہ جانتی ہے، میں جب تک ایک جھپکی لے پاتا۔ جنازے اور دعا سے پہلے تھوڑا وقت آرام کر لیتا۔"

مستری نے آنکھیں بند کی اور اونگھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے لگا کہ گھوڑی رک گئی ہے، اس نے آنکھیں کھولی اور اپنے سامنے گہرے رنگ کی جھوپڑی یا بھوسے کے جیسا ڈھیر دیکھا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے سلیج سے اتر کر پتا کرنا چاہئے تھا کہ وہ کہاں ہے مگر تھکان اور سستی نے اسے اس قدر گھیر لیا تھا کہ ٹھنڈ میں جم جانا منظور تھا مگر وہاں سے ہلنا نہیں اور وہ سکون کی نیند سو گیا۔

جب وہ جاگا تو وہ ایک بڑے سے کمرے میں تھا جہاں کی دیواریں پتی ہوئی تھیں، کھڑکی سے چمکدار دھوپ اندر آ رہی تھی۔ مستری نے دیکھا کہ وہاں لوگ موجود ہیں۔ اور پہلی بات جو اسکے ذہن میں آئی وہ یہ کہ اسے ایک سمجھدار اور عقلمند انسان لگنا چاہئے جسے سب کچھ پتا ہو۔

پادری کو بتانا چاہئے میری عورت کے لیئے دعا کرنی ہے"، اسنے کہا،

ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے، تم لیٹے رہو"، ایک آواز نے اسے ٹوکا،

پاویل ایوانچ، ڈاکٹر کو اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے مستری کی چیخ نکل گئی، حضور، ہمارے خیر خواہ

وہ اچھل کر ڈاکٹر کے پاؤں میں گر جانا چاہتا تھا مگر اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں کام نہیں کر رہے ہیں۔

حضور میرے ہاتھ کہاں ہیں اور میرے پاؤں کو کیا ہوا؟"

اپنے ہاتھ پاؤں کو الوداع کہہ دو۔ وہ جم چکے تھے، اب بس کرو اور تم رو کس لیئے رہے ہو؟ خدا کا شکر ادا کرو کہ تم اپنی زندگی جی چکے ہو، میرے حساب سے تمہاری عمر ۶۰ سال ہوگی، جو تمہارے لیئے بہت ہیں۔

میں دکھی ہو رہا ہوں، مہربانی کر کے مجھے معاف کیجئے اگر مجھے ۵۔۶ سال اور مل پاتے....."

کس لئے

گھوڑا میرا نہیں ہے، مجھے اسے واپس کرنا ہوگا۔ اپنی بیوی کی تدفین کرنی ہوگی۔ اس دنیا میں سب کچھ کتنی جلدی ختم ہو جاتا ہے! حضور، مائی باپ، پاویل ایوانچ! صنوبر کی لکڑی کا ایک سگریٹ کیس ٹھیک رہیگا! میں آپ کو کروکٹ کی بال بنا کر دوں گا"

ڈاکٹر ہاتھ ہلا کر وارڈ سے باہر نکل گیا،

مستری کا سب ختم ہو چکا تھا۔

□□□

ہمدردی

راج موہن جھا

(وفات ۲۰۱۶ء)

گینسی (Gansi) باہر بیٹھ کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے مٹروآ چائے رکھ گیا تھا۔ چائے کے ساتھ اخبار پڑنے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ اور کچھ ہو نہ ہو، اس مزے کا بندوبست گینسی نے کر لیا ہے۔ ایک قطار میں بنے ان چھ ڈی ٹائپ کوارٹرس کے آگے کافی جگہ خالی ہے۔ یہ جگہ چوڑائی میں جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے نالی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے آگے سڑک ہے۔ یہ جگہ کس کی ہے؟ نزول کی یا کمپنی کی؟ یہ گینسی نہیں جانتا لیکن اس نے اپنے کوارٹر کے سامنے جہاں صبح کو دھوپ آتی ہے۔ ایک چوکی رکھوا دی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جاڑے کی دھوپ میں بیٹھ کر چائے کی چسکی لیتے ہوئے اخبار پڑھنے سے بڑھ کر دنیا کا کوئی سکھ نہیں ہو سکتا۔

دن میں جب مرد ڈیوٹی پر چلے جاتے ہیں، اپنے اپنے کوارٹر کے آگے بیٹھ کر ان کی عورتیں ایک دوسرے کے بالوں میں جوئیں ڈھونڈتی اور مارتی ہیں۔ ان کے بچے مٹی کے برتن کے ٹکڑوں (کھپچے) سے لکیر کھینچ کر اکلے، دُکلے کھیلتے ہیں۔ گینسی نے کئی مرتبہ سوچا کہ چوری چکاری کے اس زمانے میں چوکی کو کھلے میں رکھنا مناسب نہیں مگر صبح کی دھوپ اور دھوپ میں بیٹھ کر چائے پینے کا لطف ۔۔۔ ان دونوں نے اسے چوکی اندر رکھنے سے باز رکھا۔ مٹروآ نے سب کام خوش اسلوبی سے سنبھال لیا ہے۔ ان کی ماں زندہ تھی تو انہیں کبھی رسوئی میں جھانکنے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی۔ دن بھر گلی ڈنڈا، اکلے دُکلے کھیلتے پھرتے۔

خراب دن آئے۔ صرف سات دنوں کے بخار نے ان کی ماں کی جان لے لی۔ محلے کے ڈاکٹر کی ہومیوپیتھک دواؤں سے فائدہ نہیں ہوا تو اسپتال لے جانے کی بابت وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ایک بے چارہ فورتھ گریڈ ملازم اور کر بھی کیا کر سکتا ہے؟ پھر وہ تو سرکاری ملازمت میں ہے۔ سرکاری ملازمت کتنوں کو ملتی ہے؟ یہ کوارٹر بھی اسی لئے ملا ہے، ورنہ وہ کہاں رہتا؟ وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کیا ہوتا جب؟

اخبار کے پہلے صفحہ کا آدھا حصہ وہ پڑھ چکا تھا۔ اخبار پڑھنے کا اس کا اپنا طریقہ ہے۔ پہلے صفحہ کی وہ ایک ایک سطر پڑھتا ہے۔ چاہے کوئی خبر ہو۔ روزانہ چھپنے والی عصمت دری کی خبریں، قتل اور ڈاکہ کے سماچار یا بلاتکار، دہشت گردی کی خبریں، وہ پڑھتا ہے۔ اب یہ سب اخبار کے مستقل کالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہ روز انہیں چاٹ جاتا ہے۔ مٹروآ اس کی مدد کرتا ہے۔ کچن کی ساری ذمہ داری اس نے اپنے سر لے رکھی ہے۔ اس کی بیوی کی موت کے بعد کچن پہلے اس نے خود سنبھالا تھا۔ مٹروآ تب چھوٹا تھا۔ گینسی نے آہستہ آہستہ اس سے چھوٹے موٹے کام کروانا شروع کئے۔ وہ گینسی کا پکا اسسٹنٹ بن گیا۔ پھر مختار کل بن کر گینسی کو کچن کی فکر سے مکمل طور پر آزاد کر دیا۔ بیٹے کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اپنے چھوٹے بیٹے پر گینسی کو فخر ہے۔

مگر دوسرے بیٹے کا کیا کرے؟ بڑا بیٹا منچن ما، نے اس کے خوابوں کو مٹی میں ملا دیا۔ کتنے چاؤ سے نام رکھا تھا من چن، بچپن میں گول مٹول تھا۔ سب اسے گود میں اٹھائے ہوئے پھرتے۔ سب کے دل کو چین دینے والا تھا وہ۔ اس لئے نام رکھا من چن مگر بڑا ہو کر وہ ایسا نکلا کہ اس کا نام لیتے ہوئے گینسی کانپ کانپ جاتا ہے۔ بچپن میں بھگوان جیسا معصوم تھا، بڑا ہو کر راکشس بن گیا۔ ابھی گھر میں نہیں ہے۔ گھر میں رہتا ہی کب ہے؟ اچھا ہی ہے۔ مرنے کا ایک کارن وہ من چن کی دہشت گردی ہی کو مانتا ہے۔ دارو پی کر آتا اور ماں کو نوچ کھسوٹ کر روپے چھین لے جاتا۔ محلے کا سردار بنا پھرتا ہے۔ ماں بے چاری محلے والوں کے طعنے سن سن کر دل جلاتی۔ یہ دکھ ہی اسے کھا گیا۔

بیٹے کا دکھ گینسی کو اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے لیکن وہ کر بھی کیا سکتا ہے؟ ایک دن وہ بھی اسی طرح جل جل کر مر جائے گا۔ بیٹا بھی کبھی جی کا جنجال ہوا ہے؟ مگر گینسی نے دیکھا ہے، بھوگا ہے۔ اس لئے یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔

اچانک گینسی سن رہ گیا۔ اخبار کے پہلے صفحہ

میتھلی زبان کے معروف ادیب راج موہن جھا کی متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں غلطی نامہ، بھنئے ہی وگیاپتی، آئی کالی پر سوخاصی شہرت کی حامل ہیں۔ ان کی کہانیاں عام روش سے ہٹ کر قارئین کو متاثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ پیش ہے ان کی مشہور کہانی 'ہمدردی' جس کا اردو ترجمہ **ڈاکٹر بانو سرتاج** نے کیا ہے۔

کے نچلے حصہ کی اک خبر ہی ایسی تھی۔ ارے باپ! اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ من چن کہیں گھر تو نہیں آ گیا۔ اسے موجود نہ دیکھ کر تسکین ہوئی مگر دوسرے ہی لمحہ خیال آیا کبھی نہ کبھی تو وہ گھر آئے گا۔ اس کی نظر اس خبر پر پڑ گئی تو؟ باپ رے باپ! اب اسے کون بچائے گا؟ اس کا گلا ہی گھونٹ دے گا وہ! چھرا تو ہمیشہ اس کی جیب میں رہتا ہے۔ مٹروآ کب تک بچا پائے گا اسے؟ اسے تو وہ ایک ہی دھکے میں دور پھینک دے گا۔ ہے بھگوان! کیا کیا جائے اب؟ گینسی کو لگا اخبار میں وہ خبر اس کی موت کا پیغام لے کر آئی ہے۔

اس نے مٹروآ کو آواز دی۔ وہ دوڑا دوڑا آیا تو گینسی کو سوجھا نہیں کہ اس سے کیا کہے؟ خواہ مخواہ ایک کپ چائے اور بنا لانے کو کہہ دیا۔

اس خبر کو اس نے ایک مرتبہ اور پڑھا۔ دوسری خبریں پڑھنے کو اس کا دل ہی نہیں ہوا۔ اخبار موڑ کر رکھ دیا اس نے۔ اسی وقت اپنے ایک دوست کے ساتھ منچن ما کو آتے دیکھا۔ ہڑ بڑا کر اس نے اخبار کو کہیں چھپا دینا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا۔ منچن ما دوست کے ساتھ اندر داخل ہو چکا تھا۔ گینسی نے سوچا وہ اخبار کو جلا ڈالے مگر پھر خوف دامن گیر ہوا کہ منچن ما نے دیکھ لیا تو؟ تو پھر ..... تو پھر..... اچھا وہ اس اخبار کو پرانے اخباروں کے درمیان چھپا کے رکھ دے گا۔ وہ منچن ما کے باہر جانے کا انتظار کرنے لگا۔ مٹروآ نے شاید ان دونوں کے لئے بھی چائے کا پانی رکھ دیا تھا۔

مٹروآ چائے لے کر آیا تو گینسی کا دل پھر سے اخبار پڑھنے کا ہوا مگر اس نے اس خواہش کو زبردستی کچل دیا۔ اسے اخبار کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ منچن ما گھر ہی میں تھا۔ اس کا کیا، اچانک ٹپک پڑتا اور اخبار لے کر خود پڑھنے لگتا۔ ویسے اخبار وخبار میں اب اس کی دلچسپی نہیں ہے۔ پہلے تھی، جب ملازمت کے اشتہار ڈھونڈ ڈھونڈ کر درخواستیں بھیجا کرتا تھا۔ ملازمت آج کل آسانی سے نہیں ملتی۔ وہ زمانہ اور تھا۔ سفارش، رشوت ان دنوں بھی چلتی تھی مگر آج کی طرح نہیں تھی۔ اب تو 'باپ بڑا نہ بھیا، سب سے بڑا روپیہ' چلتا ہے بلکہ باپ بڑا نہ بیٹا کہنا زیادہ مناسب ہے۔ گراموفون کے ریکارڈ کی طرح سوئی ایک جگہ رُک گئی، باپ بڑا نہ بیٹا..... باپ بڑا نہ بیٹا...

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے گینسی کا دل چاہا کہ اخبار پورا پڑھ لے لیکن پھر خیال آیا رسک لینا ٹھیک نہ ہوگا۔ اخبار بعد میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ آفس میں پڑھ لے گا۔ وہاں بھی تو آتا ہے۔ مٹروآ کی ماں نے ایک مرتبہ صلاح دی تھی۔ اس کی عقل کے حساب سے صلاح مناسب ہی تھی۔ کہا تھا، جب آفس میں اخبار آتا ہے تو وہیں بیٹھے بیٹھے کیوں نہیں پڑھ لیتے جو یہاں بھی اٹھونا، لگا رکھا ہے۔ بے مطلب، فالتو کا خرچ۔

وہ بیچاری کیا جانے کہ آفس میں ایک بابو کے ہاتھ سے دوسرے اور دوسرے کے ہاتھ سے تیسرے بابو کے پاس جاتے جاتے اخبار کہاں غائب ہو جاتا ہے، اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جب تک اس کی باری آئے گی اخبار کی چندی چندی ہو جائے گا اور مان لو، کبھی پہلے بھی مل جائے تو آفس کے اسٹول پر صاحب کی گھنٹی کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے اخبار پڑھنے کا کیا مزا!؟ اپنے ڈیرے پر بے فکر ہو کر پڑھنے میں جو مزا ہے اس کی بات ہی اور ہے!

مٹروآ کی ماں اسے اخبار پڑھتا کر چڑھتی اور کہتی، 'اتنا پیسہ بے برباد کرے ہئی، ایک بار جیچھو سے کونو نمن کام کرت سے نہ لی۔' تب گینسی دل ہی میں مسکرا کر کہتا، 'کم عقل عورت! تم کیا جانو! اخبار کتنی اچھی چیز ہے۔'

سچ! اخبار گینسی کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ اب تو پہلے سے زیادہ بڑا سہارا بن گیا ہے۔ اسی لئے ساگ، سبزی، کپڑے، لتے میں کٹوتی اسے منظور ہے لیکن اخبار خریدنا کبھی اس نے فضول خرچی میں شمار نہیں کیا۔ بھئی، دیش دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے اور بہت نہ سہی، ردی میں بیچ کر کچھ پیسے بھی تو حاصل ہو جاتے ہیں اور پھر جاڑے کی دھوپ میں بیٹھ کر چائے کی چسکیوں کے ساتھ اخبار پڑھنے کا مزا! اس کی تو کوئی قیمت ہی نہیں۔

لیکن گینسی کی اس خوشی میں آج خلل پڑ گیا ہے۔ پتہ نہیں کیسے وہ خبر اخبار میں چھپ گئی۔ جتنا اسے دل و دماغ سے نکالنا چاہا وہ چپکتی گئی۔

مٹروآ آیا تو پوچھا، 'بابو جی! آج آفس نہیں جائیں گے کیا؟ کب تیار ہوں گے؟'

گینسی نے پوچھا، 'تمہارا بھیا کیا کر رہا ہے؟'

'ارے! ابھی تو وہ اور اس کا دوست آپ کے سامنے سے نکل کر باہر گئے ہیں۔'

گینسی خیالات میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ واقعی اسے پتہ ہی نہیں چلا مگر اپنی یہ بھول اسے کچھ ٹھیک نہیں لگی۔ اسے اتنا بے خبر نہیں رہنا چاہئے۔

اس نے مٹروآ سے پوچھا، 'کھانا بن گیا؟'

'آپ نہائیے، تب تک بن جائے گا۔' گینسی اٹھ گیا۔ نہانے کے لئے نل پر جانے سے پہلے مٹروآ کی آنکھ بچا کر اخبار اس نے پرانے اخباروں میں گھسا کر رکھ دیا لیکن اخبار کی جو خبر اس کے دل پر نقش ہو گئی تھی اس کا وہ کیا کرے؟ آفس میں بھی یہی خیال دماغ میں چکر کاٹتا رہا۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ اخبار والی خبر کا پس منظر اس کے اپنے پس منظر سے کتنا میل کھاتا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے حالات کو ہو بہو خبر میں اتار دیا گیا ہو۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ حالات ایک جیسے ہوں تو انجام بھی ایک جیسا ہی ہوگا۔ خبر میں حالات وہی، ماحول وہی، کردار وہی ہیں تو انجام کو اپنا انجام کیوں نہ سمجھ لے؟ جب اس نے یہ خبر پڑھی تھی تو ایک دم خوفزدہ ہو اٹھا تھا مگر اب وہ سوچ سمجھ کر اس پر غور کر رہا ہے۔ اب اس کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ منچن ما پہلے ایسا نہیں تھا۔ بی اے سیکنڈ ڈویژن پاس ہوا تھا مگر جب کئی جگہ

انٹرویو دینے اور کئی جگہ اچھا انٹرویو دینے کے بعد بھی کہیں ملازمت نہیں ملی تو اس کا بھروسہ اٹھ گیا۔ وہ باغی ہوگیا۔ گینسی سمجھتا ہے اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ آدمی آخر کہاں تک برداشت کرے گا۔ ستم یہ ہوا کہ اس دوران من چن ما کے دماغ میں یہ خرافات جانے کہاں سے راہ پا گئی کہ اس کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے اس کا ذمہ دار اس کا اپنا باپ ہے۔ اب اس کا ہے کوئی جواب؟ جہاں تک سفارش کی بات ہے اس نے اپنے طور پر پوری کوشش کی، اپنے صاحب سے بھی اور دوسرے سورسیز سے بھی لیکن ہر جگہ ہزاروں میں رشوت مانگی جاتی۔ وہ آخر دس بیس ہزار کا انتظام کہاں سے کرتا؟ منچن ما نے دل میں گانٹھ باندھ لی کہ اس کا باپ اس کے لئے روپیہ خرچ کرنے کو تیار نہیں۔ اس کا غصہ کبھی کبھی اتنا بڑھ جاتا کہ باپ کے منھ پر کہہ دیتا، 'تم مر جاؤ تو تمہاری جگہ مجھے ملازمت مل جائے۔ ویسے بھی سال ڈیڑھ سال میں رٹائر ہونا ہی ہے۔' گینسی کے دل میں کئی مرتبہ خیال آیا کہ کاش! بھگوان سچ مچ اسے اٹھا لیتے۔ مگر مرنا کیا اپنے ہاتھ میں ہے؟ اب وہ اگر جی رہا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اسے اپنی پتنی سے حسد ہوتا ہے۔ مر کر کم سے کم وہ اس اپمان سے تو بچ گئی۔

گینسی کو لگتا ہے کہ اگر وہ واقعی مر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ منچن ما کو ہمدردی کے تحت ملازمت ملنا طے ہو۔ ابھی جو حالات ہیں ان میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ قانون قاعدے اپنی جگہ مگر ہوتا وہ ہے جو صاحب لوگ چاہتے ہیں۔ حالات اتنے سنگین ہیں کہ چپراسی اور دربان تک کے لئے منتری اور مکھ منتری کے فون آتے ہیں۔ ایسے تو گینسی کا باپ بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ گینسی لال کی کیا بساط؟ لیکن بیٹا یہ سمجھے تب نا!

غصہ میں بیٹا باپ کو مار ڈالے، یہ بات بعید از قیاس ہے مگر وہ بھی تو ماں کا بیٹا تھا جس نے ایسا شرمناک کام انجام دیا۔ حقیقت ہی خبر بناتی ہے اور خبر حقیقت بنتی ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ فلمیں دیکھ کر جرائم کرتے ہیں اور پکڑے جانے پر قبول کرتے ہیں کہ جرم کرنے کا خیال انہیں فلاں فلم دیکھ کر آیا۔ گینسی جانتا ہے کہ وہ چاہے کچھ سوچے، جو ہوگا اسے وہ روک نہیں پائے گا۔ بھگوان کی مرضی کو وہ مقدم جانتا ہے۔ اخبار چھپا دینے سے کیا ہوگا؟ بیٹے کے ہاتھوں مرنا اگر اس کی قسمت میں ہے تو اسے یہ منظور ہے۔ ہاں مرتے وقت اسے ایک دکھ ضرور رہے گا کہ مٹروآ جسے اس وقت اسکول میں پڑھائی کرنی چاہئے تھی، اس کی وجہ سے گرہستی کے کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔ اس نے اپنے اس بیٹے کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ کسی انگریزی اسکول میں نہ سہی، سرکاری اسکول میں تو داخلہ کروا سکتا تھا اس کا۔ بس اتنا فرق پڑتا کہ اسے آفس سے پہلے اور بعد میں رسوئی بھی سنبھالنی پڑتی۔ تو کیا ہوتا؟ اپنے بیٹے کے لئے، اس کے روشن مستقبل کے لئے کیا وہ اتنا بھی نہیں کرسکتا تھا؟

اسکول میں گینسی نے سنسکرت کا ایک شلوک پڑھا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ پوت (بیٹا) بھلے ہی کپوت (برا) نکل جائے ماتا کبھی کماتا (خراب ماں) نہیں ہوتی۔ اسی طرز پر گینسی نے سوچا باپ بھی کُباپ نہیں ہوتا، بیٹا چاہے کتنا ہی کیسا بن جائے۔

گینسی نے فیصلہ کرلیا کہ مٹروآ اب رسوئی کا کام نہیں کرے گا۔ وہ اسکول جائے گا۔ گینسی اسے پنسل، کاپی، کتاب خرید کر لا دے گا کیونکہ اس کے مستقبل کے دروازے بند کرنے کا کسی کو اختیار نہیں، اس کے باپ کو بھی نہیں۔ ابھی تک اس نے مٹروآ کی پڑھائی کی طرف سے غفلت برتی تھی کیونکہ اس میں اس کی غرض پوشیدہ تھی لیکن اب آگے ایسا نہیں ہوگا۔ لمحہ بھر کے لئے گینسی کو یہ خیال آیا کہ مٹروآ پڑھ لکھ کر کہیں منچن ما کے راستہ پر نہ چل پڑے۔ منچن ما کو ملازمت نہیں ملی تو اسے مل جائے گی اس کی کیا گارنٹی؟ وہ بھی باپ سے نفرت کرنے لگے تو؟ مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے ان بیکار خیالات کو دماغ سے جھٹک دیا۔ اسے ایسی فضول باتیں نہیں سوچنا چاہئے۔ اسے اپنے باپ ہونے کا فرض نبھانا چاہئے۔ بیٹے کا فرض بیٹا جانے۔

گینسی آفس سے لوٹا تو کافی مطمئن تھا۔ دور ہی سے اس نے دیکھا کہ منچن ما اپنے دو مسٹنڈے ساتھیوں کے ساتھ باہر کی چوکی پر بیٹھا تھا۔ اس کے قدم تھمنے لگے کیونکہ منچن ما شام کو کبھی گھر میں نہیں رہتا تھا۔ وہ آگے بڑھا مگر اس کے پاؤں میں جیسے طاقت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ تھوڑا اور آگے بڑھا تو دیکھا منچن ما کے سامنے آج کا اخبار کا پہلا صفحہ کھلا پڑا تھا۔ اسے یہ اخبار کہاں سے ملا؟ گینسی تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوا تاکہ دیکھے کہ پرانے اخباروں کے بنڈل میں اس نے جو اخبار چھپا دیا تھا وہ وہاں ہے یا نہیں؟ مگر وہ ایسا نہیں کر سکا کیونکہ مٹروآ وہیں آ بیٹھا تھا۔ باپ کو اندر آتے ہی اخبار الٹ پلٹ کرتے دیکھتا تو اسے اٹ پٹا لگتا۔

باپ کو آیا دیکھ مٹروآ نے کہا 'آ گیلہو بابو جی، چاہ بنوے چھیو؟' اور اٹھ کر رسوئی میں چلا گیا۔ گینسی نے جوتے اتارے اور نڈھال ہو کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس میں اب اتنی طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ اخبار کے بنڈل میں سے اخبار ڈھونڈتا۔ اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے کہ منچن ما کو اخبار کہاں سے ملا؟ اس نے بنڈل میں سے نکالا یا خرید کر لایا ہے۔ اس کے دماغ میں اس خبر کی سرخی گھوم رہی تھی۔ 'ہمدردی کی بنا پر ملازمت حاصل کرنے کے لئے باپ کا قتل'

اس نے آنکھ اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ منچن ما ابھی تک اندر نہیں آیا تھا مگر وہ کسی بھی لمحہ اندر آ سکتا ہے۔ دروازے کی طرف سے آنکھیں پھیر لینے پر بھی وہ منچن ما کو اندر گھستے دیکھ سکتا ہے۔ اس نے چیخ کر مٹروآ کو بلایا۔ وہ دوڑا دوڑا آیا تو اس کا ہاتھ گینسی نے مضبوطی سے تھام لیا جیسے اس بیٹے کی ہمدردی ہی اب دوسرے بیٹے سے اس کی حفاظت کرسکتی ہے۔

□□□

پہلا روزہ اور رمضان کی کچھ یادیں

نصرت ظہیر
C280، سکینڈ رفلور، خسرو اپارٹمنٹ، شاہین باغ، نئی دہلی موبائل: 9716145593

آدمی اگر انسان ہو تو ایک واقعہ اور مسلمان ہو تو دو واقعے کبھی نہیں بھولتا اور دوسرا واقعہ ہے پہلا روزہ۔ آپ پوچھیں گے پہلا واقعہ کون سا ہے، تو پلیز یہ سوال مجھ سے کر کے خود ہی شرمندہ نہ ہوں۔ خاص طور سے شادی شدہ بزرگان کرام۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ زندگی کے اس مرحلے کو انھوں نے قاضی اور دو گواہوں کی موجودگی میں بسر وچشم خود ہی قبول کیا تھا اور بڑی دھوم دھام سے اپنے انتقال پر ملال کا جشن منایا تھا۔ ویسے پچھتاوا تو غیر شادی شدہ بزرگوں کو بھی ہوتا ہے کیونکہ یہ ہے ہی وہ لڈو جسے کھائے گا تب بھی پچھتائے گا اور نہ کھائے گا تب بھی پچھتائے گا۔ کئی لوگ یہ فلسفہ بگھارتے ہیں کہ اگر پچھتانا ہی ہے تو آدمی لڈو کھا کر ہی کیوں نہ پچھتائے۔ میرا خیال ہے ایسے لوگ بعد میں زیادہ پچھتاتے ہیں۔ مشکل دراصل یہ ہے کہ زندگی اپنے اہم ترین معاملوں میں آدمی کو تجربے کا موقع نہیں دیتی۔ خاص طور پر ہمارے یہاں مشرق میں لوگوں کو شادی سے پہلے شادی کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ جب کہ مغرب میں رواج یہ ہے کہ شادی بہت سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے۔ پہلے میاں بیوی ایک دوسرے کو خوب ٹھوک بجا کر دیکھ لیتے ہیں، بچّے پیدا کرتے ہیں اس کے بعد ہی عموماً کسی اور سے شادی کرتے ہیں، پہلے نہیں۔ آفیشیل شادی سے پہلے نان آفیشیل شادی کا یہ رواج خیر سے اپنے یہاں بھی داخل ہو گیا ہے مگر افسوس ابھی تک پوری طرح پھیلا نہیں ہے۔ اس کے بعد زندگی کا دوسرا اہم ترین معاملہ موت ہے۔ اس کا بھی لوگوں کو کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو شادی اور مرگ دونوں کو ایک مانتے ہیں اور شادی مرگ ہو جاتے ہیں۔ استغفراللہ!

اس تمام خرافات اور بیہودہ گوئی کو یہیں لگام دے کر اس واقعے کی طرف آتے ہیں جو مسلمان کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ جانے والا اس کی زندگی کا پہلا اہم واقعہ ہے لیکن پہلے چند باتیں رمضان کے اس مبارک مہینے کے بارے میں جس میں عموماً یہ واقعہ وقوع پذیر ہوتا اور جو مہینہ کم، مہینے بھر کا تہوار زیادہ ہے۔ پہلے دن سے ہی یہ مہینہ پورے ماحول کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ مذہبی طور پر بھی اور سماجی طور پر بھی۔ کھانے پینے اور سونے جاگنے کے معمولات ہی نہیں عادتیں بھی بدل جاتی ہیں۔ بازاروں میں کچھ زیادہ رونق آجاتی ہے۔ چہرے کچھ زیادہ پرسکون نظر آنے لگتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اس مہینے سے ہی کچھ ایسی انسیت ہو جاتی ہے کچھ مت پوچھئے۔ برسوں پہلے کے وہ شب و روز آج بھی میری یادوں میں محفوظ ہیں جب رمضان کا آخری ہفتہ آتے آتے روزہ داروں کے چہروں پر چمکنے والی پرنور نقاہت میں افسردگی کی بھی ایک لکیر نمایاں ہونے لگتی تھی۔ یہ احساس کہ بس اب چند روز میں سحر و افطار کا یہ سلسلہ منقطع ہو جائے گا لوگوں کو اکثر اداس کر دیا کرتا تھا۔ رمضان کی آخری سحری کی راتوں میں ہمارے پڑوسی ناظم علی خاں مرحوم کی میلاد پارٹی جب سہارنپور کی سڑکوں پر وداع نامہ گاتے ہوئے گزرتی تھی تو دل پر ایک عجیب ہی اثر ہوتا تھا۔

گہری سیاہ رات... آگے آگے کوئی بڑا سا پیٹرومیکس لیمپ کاندھے پر اٹھائے چل رہا ہے، اس کی روشنی میں ناظم خاں اور ان کے ایک خوش الحان دوست... غالباً راؤ سرور خاں... میلاد کے نعتیہ کلام کا بڑا سا رجسٹر اٹھائے نعتیں پڑھتے ہوئے آہستہ قدموں سے آرہے ہیں اور ان کے پیچھے بیس تیس لوگوں کی ایک ٹولی لے میں لے ملا کر نعتوں کے مصرعے اٹھاتی ہوئی سڑک سے گزر رہی ہے... **یا نبی سلام علیك ۔ یا حبیب سلام علیك یا رسول سلام علیك صلوات الله علیك**... سحری میں آنکھ کھلنے پر رات کی خاموشی میں دور سے آتی ہوئی ناظم خاں اور ان کے ساتھیوں کی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز... "الوداع اے ماہ رمضاں الوداع" سن کر دل جیسے غم سے بھر جاتا تھا۔

اور پھر آخری افطار کا منظر... بڑی سی سفید چادر پر افطاری سے سجا ہوا پُر بہار دسترخوان... روزہ کھولنے کے وقت کا اعلان کرنے والے گولے کے دغنے کا انتظار... اور اس انتظار پر غالب آجانے والا یہ احساس کہ کل سے یہ دسترخوان یوں نہیں سجے گا... عید کے چاند کی خوشی بھی کچھ کم سی ہو جاتی تھی... یہ باتیں تب کی ہیں جب کوئی مہمان آتا تھا تو دل خوش ہوتے تھے اور جاتا تھا تو آنسوؤں سے رخصت کیا جاتا تھا۔ آج اس سب کی فرصت کہاں۔ اور ہو بھی تو خیال کسے آتا ہے۔ ان دنوں کی بات ہی اور تھی۔ محمد رفیع کی آواز میں:

کرتا ہے ایک راویٔ دل سوز یہ بیاں
رمضان کے مہینے کی مشہور داستاں

مذہبی کتابچوں اور مسجد کے مولوی صاحب کی نصیحتوں سے کہیں زیادہ دل کو چھو لینے والے اس گرامو فون ریکارڈ نے چھ سات سال کی عمر میں روزہ رکھوا دیا تھا... امّی واقعی پریشان ہو اٹھی تھیں... "روزہ نہیں

ہے فرض ابھی تجھ پہ میرے لال"...

لیکن والد صاحب خوش تھے...دوپہر بعد تو پوری گلی میں خبر پھیل گئی...بابو عزیز کے لڑکے نے پہلا روزہ رکھ لیا ہے...ارے اتنی گرمی، اور استاد بلا پتلا سا تو ہے...دلہن اسے گھر کے اندر ہی رکھو۔ باہر مت نکلنے دینا۔ اچھا...سو رہا ہے، چلو سونے دو جگا نا مت...مگر روزہ دار بچہ آنکھ میچے نہ صرف جاگ رہا ہے بلکہ اندر ہی اندر خود کو ڈانٹ بھی رہا ہے کہ بے وقوف، کیا ضرورت تھی شیخی بگھارنے کی! اب بھگت...گولا چھوٹنے میں پورے پانچ گھنٹے باقی ہیں۔ پانی تو خیر سحری میں خوب پیا تھا۔ عام دنوں سے دگنا، کہ رفیع صاحب بار بار یاد دلا رہے تھے:

پانی بغیر پیاس سے خشک ہو گیا گلا
کم سن تھا نازنین تھا چکرا کے گر پڑا

اس لیے پیاس تو اتنی نہیں لگ رہی تھی۔ لیکن بھوک؟...سحری کے پراٹھے اور کھجلا پھینی، بند آنکھوں میں گھومنے لگتے تو خالی پیٹ جیسے درد کا آسمان بن جاتا تھا...بھوک کا درد...دنیا کا سب سے بڑا درد...یوں کہیے کہ تمام دردوں کا مغلِ اعظم، جس کا علاج ہمدرد دواخانہ وقف کے پاس بھی نہیں۔ اور ایک گھنٹے بعد تو درد باقاعدہ آنسوؤں میں ڈھلنے لگا۔ دائیں ہاتھ کی آستین گیلی ہونے لگی...لیکن اس پِدّی سے بچّے کی ہوشیاری ملاحظہ فرمایئے۔ جہاں کوئی کمرے میں داخل ہوا جھٹ کروٹ بدل لی اور ایسے بن گئے جیسے کمبھ کرن کے بھی باپ ہوں...

آخر..."دوپہر ڈھل کے عصر کا جب وقت آ گیا"...ملنے والے آنے لگے۔ جسے دیکھئے ہاتھ میں افطاری کا سامان لیے چلا آ رہا ہے۔ عورتیں اندر کمرے میں آ آ کر روزہ دار بچّے کی زیارت کرنے لگیں۔ اور زیارت ہی نہیں ہاتھ سے چھوتی بھی جاتیں۔ سر پر ہاتھ پھیرتیں۔ ہئے ہئے دیکھو تو کیسا مزے سے سو رہا ہے، ماشا اللہ...بڑا جی دار بچّہ ہے تمہارا آپا امینہ...اب نور جہاں خاتون کو یہ کون بتاتا کہ جی دار بچّہ دراصل مارے شرم کے دبکا پڑا ہے، ورنہ اس کا بس چلے تو کیسا روزہ کیسے رمضان اور کہاں کے محمد رفیع۔ سیدھا دوڑ کر باورچی خانے میں گھس جائے اور دو گھنٹے تک خود کو وہیں اندر سے بند کیے رکھے۔ اوہو، تو اِس والے نے روزہ رکھا ہے۔ میں تو اسے یوں ہی باؤلا سمجھتی تھی۔ یہ تو بڑا اللہ والا نکلا...وہ تو ٹھیک ہے مگر عصر کا وقت ہو چلا، اب اسے نماز کے لئے اٹھا دینا چاہیے...تم بھی کیا بات کرتی ہو رقیہ...ابھی سات آٹھ سال کا ہی تو ہے...ہاں بھئی، بچّوں پر نماز کہاں فرض ہے۔ ان کی نماز پڑھنا تو فرشتوں کے ذمّے ہے...مگر یہ تو دیکھو، گرمیوں کا روزہ ہے۔ بی بی میں تو کہتی ہوں بچّے کو درود شریف پڑھ کے شربت پلوا دو...بے چارا ننھی سی جان۔ اب تک تو اس کا روزہ قبول بھی ہو چکا ہوگا...

ننھی سی جان کی جان میں جان آئی...آنکھوں میں بند آسمان سے شربتِ روح افزا کی برسات ہونے لگی...نہیں بھئی، ایسا نہیں کرتے۔ ہمّت والا بچّہ ہے۔ بس ڈیڑھ دو گھنٹے کی ہی تو بات ہے...ہاں بھئی ہاں رقیہ آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں...کہیں روزہ تڑوانے کا عذاب نہ گلے پڑ جائے...ہمّت والے بچّے کے جی میں آیا کہ ابھی چھت پر سے کوئی ڈنڈا لا کر پوری طاقت سے خالہ رقیہ کی کمر پر دے مارے...مگر جی مسوس کر رہ گیا۔

گھر میں آہستہ آہستہ اتنے لوگ آ چکے تھے کہ کسی سے چھپ کر کچھ کھا لینے کا بھی موقع نہیں تھا۔ بابو جی سہارا سا دے کر صحن میں لائے تو ہر طرف چارپائیاں بچھی تھیں جن پر سفید چادروں کے اوپر طرح طرح کی پلیٹیں، تھالیاں، سینیاں، رکابیاں اور ڈونگے ڈھکے ہوئے رکھے تھے...یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر پتہ نہیں کہاں سے پانی کے سوتے جاگ اٹھے اور خشک گلا کچھ ایسا تر ہوا کہ کھانسی کا پھندہ لگ گیا...

پھر ان تھالیوں اور ڈونگوں کا سامان ایک بہت بڑے دسترخوان پر سجایا جانے لگا تو جیسے آسمان چاند ستاروں سمیت زمین پر بچھ گیا۔ کیا ہے جو نہیں تھا...پھلکیاں، پکوریاں، پالک کے پکوڑے، آلو کی پکوڑیاں، شکر پارے، برفی، امرتی، جلیبیاں، نمک پارے، تلے ہوئے چنے، بھنا ہوا قیمہ، آم، امرود، خربوزہ، زردہ، پلاؤ، قورمہ، نان، کوفتے...کہاں تک یاد کیجئے...کچھ اپنے گھر کا، باقی سب دوسرے گھروں کا...روزے دار بچّے نے اپنی ضد میں امّی اور بابو جی کو پہلے سے کچھ تیاری، اور اوّل روزہ کشائی پر لوگوں کی باقاعدہ دعوت کے اہتمام کا موقع ہی کہاں دیا تھا...لیکن لمبی سی گلی کے پڑوس نے اس کی ضرورت ہی ختم کر دی...وہ گلی جس کی ناک خود اس کی لمبائی سے بھی اتنی زیادہ لمبی تھی کہ ہر گھر کے اندر کونے کھدرے میں چھپی خوشی یا غم کو بھی دور سے سونگھ لیتی تھی۔

اس شام کب افطار کا گولا دَغا، کیسے روزہ کشائی ہوئی، منھ اور معدے میں ذائقوں کی کیسی آتش بازیاں چھوٹیں...کچھ یاد نہیں...بس وہ گلی اور اس کا دسترخوان حافظے میں روشن ہے۔ روزہ دار بچّہ آج دہلی شہر کے ایک عالیشان علاقے میں دوسری منزل کے فلیٹ نمبر 37 میں رہتا ہے جہاں اسے یہ نہیں معلوم کہ 36 نمبر میں کون مقیم ہے اور 38 نمبر میں کس کی رہائش ہے؟ ہر دروازے سے روزانہ کچھ چہرے باہر نکلتے ہیں، پھر پتہ نہیں کب ان ہی دروازوں کے پیچھے جا کر گم ہو جاتے ہیں۔ خیر...اچھا تو میاں قبلہ محترم رمضان شریف صاحب، بہت سمع خراشی ہوئی۔ اب آپ خیر سے جایئے۔ آپ نے ہمیں خوش رکھا، خدا آپ کو خوش رکھے۔ زندگی رہی تو اگلے سال پھر ملاقات ہوگی۔ بس اتنی سی گزارش ہے کہ اس بار تشریف لائیں تو اللہ میاں سے کسی ایسی منزل یا فلیٹ کا پتہ ضرور لے کر آئیں جہاں چہرے اجنبی، دروازے نا آشنا اور کھڑکیاں گونگی بہری نہ ہوں... جہاں 36، 37 اور 38 سب ایک دوسرے کو جانتے ہوں...سب کے پاس ایک دوسرے کو جاننے کا وقت ہو...خدا حافظ...الوداع!الوداع!

□□□

کتابیں اصل میں پہچان ہیں تخلیق کاروں کی...!!

ماہنامہ 'نیادور' کو تنقیدی، تحقیقی، تخلیقی اور ادبی صحافت سے متعلق کتابیں خاصی تعداد میں موصول ہو رہی ہیں۔ یہاں پر موصول ہونے والی کتابوں کی فہرست سازی کی جاتی ہے۔ پھر اسی اندراج نمبر کے تحت ان کتابوں کو تبصرے کے لئے بعض مبصرین کو دی جاتی ہیں۔ کسی مبصر کو کتاب دینے سے پہلے اس بات کا ضرور خیال رکھا جاتا ہے، کہ تبصرہ نگار کو اسی موضوع کے مطابق کتابیں دی جائیں۔ جس میدان میں اُسے مہارت حاصل ہو۔ چاہے وہ فکشن نگاری کا میدان ہو یا تحقیق و تنقید کا یا شاعری کا۔ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے۔ تاکہ تخلیق کار کی تخلیق کے ساتھ کسی طرح کی ناانصافی کا کوئی امکانی جواز باقی نہ رہ جائے۔ تبصرے کے لئے دی جانے والی کتاب جب ہمیں مبصر کی تحریر کے ساتھ موصول ہوجاتی ہے، تب کہیں جاکر ہم 'نیادور' کے تبصرے کے کالم اس کی اشاعت کا اہتمام کرتے ہیں۔ جیسا کہ نیادور کے بیشتر شمارے میں آپ تبصراجات والے کالم میں مختلف کتابوں پر تبصرہ ملاحظہ کرتے ہیں۔

گزشتہ ایک برس میں نیادور کو 150/کتابیں موصول ہوئیں۔ جن میں صرف شاعری کی دیگر اصناف سے متعلق ۸۴/شعری مجموعے شامل ہیں۔ ایک اور بات جو قابل ذکر ہے۔ جس کا یہاں پر تذکرہ کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا۔ نیادور کو جو کتابیں موصول ہوئی ہیں، ان ساری کتابوں پر تبصرہ کرنا ایک ناگزیز عمل ہے۔ لیکن ماہنامہ نیادور کی شروع سے یہ کوشش رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتابوں پر تبصرہ شائع ہو سکے۔ اس لئے ہم مسلسل اپنے ہر شمارے میں تبصرے میں کچھ کتابوں کو ضرور جگہ دیتے ہیں۔ اس سے پہلے دسمبر ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ''ایر انڈز'' میں کچھ خاص کتابوں کو شامل کیا گیا تھا۔ جن میں کچھ شعری مجموعے بھی تھے۔ اس بار ادارے نے بقیہ بچے ہوئے شعری مجموعوں میں سے کچھ اہم مجموعہ کو تبصرے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ جنکی تعداد ۱۷/ ہیں۔ ادارے کی طرف سے منتخب کئے گئے ان مجموعوں کا یہاں پر ایک اجمالی تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

''خواب پلکوں میں'' یہ شعری مجموعہ وشال کھلر کا ہے۔ اس مجموعے میں کل ۵۴/غزلیں، ۳۹/نظمیں اور ۷/نثری نظمیں شامل ہیں۔ ان کا غزلوں کا مزاج کلاسکی ہے۔ لیکن لفظوں کے انتخاب اور اس کی نشست و برخواست سے غزلوں کی فضا میں نئے پن کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں استعمال ہونے والے موضوع کو اچھے انداز سے برتنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن ان کے بعض اشعار ایسے ہیں جس کی برجستگی لوگوں کو اپنی طرف ضرور متوجہ کرتی ہے۔ اس مجموعے میں موجود زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں۔ زیادہ تر غزلوں کا لہجہ و آہنگ استفہامیہ ہے۔ جس کی وجہ سے غزلیں قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں ایک حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔

اس مجموعے میں موجود نظموں کا اپنا ایک الگ عنوان اور موضوع ہے۔ مثلاً! ''لہو بو رہا ہوں'' جھیل کے کنارے'' ''خواب نامہ'' ''میں کرشن ہوں'' آتش کدہ'' احتجاج'' جب لفظ کی وادی میں'' نظموں کے ان عناوین سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کے موضوعات کیا ہیں، اور ان کا تعلق ہمارے سماج سے کس حد تک مماثلت و مناسبت رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں موجود نظمیں، غزلوں سے زیادہ معنی خیز ہیں اور انکا آہنگ و اسلوب کافی توانا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں ان کا بنیادی مزاج نظموں سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

اس مجموعے میں موجود نثری نظمیں میں وہ توانائی اور لہجہ کا وہ تیور محسوس نہیں ہوتا جیسا کہ ان کی غزلوں اور معری اور غیر معری نظموں میں ہے۔ اس لئے نثری نظمیں اپنے متن اور معنی کے اعتبار سے اپنا تادیر تاثر قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۷۶/صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا سرورق کافی دیدہ زیب ہے۔ اس کتاب کی قیمت ۳۰۰/روپیہ درج ہے۔ وشال کھلر ابھی ایک نوجوان شاعر ہیں۔ اس سے پہلے ان کے ایک شعری مجموعہ 'دھند میں اماں' پر ساہتیہ اکادمی کی طرف ۲۰۱۱/میں ''یوا پرسکار'' نوازا جاچکا ہے۔

''ہجوم آئینہ'' یہ شعری مجموعہ ڈاکٹر فرید پربتی کا، جو ۴۵۱/صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں نعت، حمد، دعا، غزلیں اور قطعات کے علاوہ دیگر موضوعات سے متعلق اشعار موجود ہیں، اور اس مجموعہ میں ڈاکٹر فرید پربتی کی شاعری سے متعلق کچھ اہم ناقدین اور دانشوروں کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰۱۰ء میں ہوئی ہے اور اس کتاب کی قیمت ۵۰۰/روپیہ ہے۔

''رقص صدا'' یہ شعری مجموعہ ڈاکٹر معظم علی خاں کا ہے۔ اس مجموعہ کو مصنف نے اپنے والدین اور اپنی اہلیہ مرحوم کے نام انتساب کیا ہے۔ اس مجموعہ میں پیش لفظ ''اسلم حنیف'' نے لکھا ہے اور پروفیسر وحید الظفر خاں نے ان کی شاعری سے متعلق ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا

ہے۔اس مجموعہ میں شاعر نے "اپنی بات" کے عنوان سے اپنا اور اس کتاب کا ایک تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔اپنے روایتی انداز کے مطابق اس کا آغاز مناجات اور نعت جیسی پاکیزہ صنف سخن سے کیا ہے۔اور اس میں شاعری کی دیگر اصناف سخن سے متعلق بھی اشعار موجود ہیں کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔
اس کی قیمت 400 ررروپیہ تجویز کی گئی ہے۔اس کی ترتیب وتدوین کا کام، مجیب شہزر نے کیا ہے۔

"سفر آخری" اس شعری مجموعہ کے خالق ڈاکٹر حقیر آستانی ہیں،اور اس سے پہلے بھی ان کے ۴رشعری مجموعے "افکار گریزاں" "خبط وضبط" "آدمی درندہ ہے" "رقص عطش" شائع ہو چکے ہیں۔

زیر تبصرہ شعری مجموعہ "سفر آخری" یہ اُن کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ انھوں نے اپنے اس شعری مجموعہ کی ابتدا "حمد" سے کی ہے۔اوراس م میں غزلوں کے ساتھ کچھ مختلف عنوان سے نظمیں بھی موجود ہیں۔یہ کتاب ۲۳۸رصفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کی ترتیب وتدوین ،وشال چندسین نے فرمائی ہے۔اس مجموعہ میں شاعر نے "اپنی بات" کے عنوان سے ایک صفحہ مختص کیا ہے۔جس میں انھوں نے اپنے تعارف کے ساتھ اپنی شاعری کے بارے میں بھی کچھ اہم چیزیں بیان کی ہیں۔

"گیت بھی تو، غزل بھی تو" یہ شعری مجموعہ سعید رامش کا ہے۔جو اپنے صوری اور معنوی حسن کے مطابق قابل دید ہے۔اس کتاب کے شروع میں کچھ اہم مضامین شامل ہیں جو مختلف دانشوروں نے ان کی شاعری سے متعلق تحریر فرمائے ہیں۔ان کے اس شعری سرمایہ میں "حمد و نعت" کے ساتھ صرف غزلیں ہیں۔یہ مجموعہ ۲۵۶رصفحات پر مشتمل ہے۔آخر میں ایک صفحہ "اغلاط نامہ" کا ہے جس میں کتابت کی وجہ سے درآنے والی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی۔یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔اس کی قیمت ۲۵۰روپیہ ہے۔

"روشنی کا سفر" اس شعری مجموعہ کے خالق مہدی پرتاب گڑھی ہیں۔اس کتاب کو "نونہالان قوم کے نام انتساب کیا گیا ہے۔ چونکہ تخلیق کار نے خاص طور سے بچوں کے اخلاقی کردار سازی، سبق آموز کہانیوں، پہیلیوں اور کہاوتوں کو اپنی تخلیقی ہنر مندیوں سے اور فنکارانہ مہارتوں سے اسے شعر کے قالب میں بڑے خوبصورت پیرائے میں نظم کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔اس کتاب میں صاحبان فہم و فراست کے ان تاثرات کو بھی شامل کیا گیا ہے جو اس کتاب سے متعلق ہے۔یہ مجموعہ ۱۵۹رصفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کے آخری پیج پر مصنف کی دیگر شعری تخلیقات کے نام بھی شامل ہیں جو اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں۔اس کی قیمت ۹۶روپیہ درج ہے، اور اس کتاب کے ناشر خود مصنف ہیں۔

"گفتگو" یہ شعری مجموعہ حیدر علوی کی بہترین شعری تخلیق کا منہ بولتا ہوا ثبوت ہے۔اس مجموعہ مذکور کا سرورق انتہائی دیدہ زیب ہے،اوراس کے پس ورق کو شاعر کی تصویر کے ساتھ مختلف شعرا اور دانشوروں کے اقتباسات

"لب اظہار" اس شعری مجموعہ کے خالق کا نام روشن لال روشن ہے۔اس مجموعے میں کل ۱۱۹رغزلیں ہیں۔یہ خالص غزلوں کا مجموعہ ہے۔اس مجموعہ میں غزلوں سے پہلے تین صفحات پر مشتمل اردو زبان وادب کے مشہور ادیب ونقاد شمس الرحمن فاروقی کا ایک توثیق نامہ بھی شامل ہے۔جس میں شمس الرحمن فاروقی نے روشن لال روشن کی شاعری سے متعلق اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

روشن لال روشن چھوٹی بحروں میں اپنے مفہوم کی ترسیل بڑی فنی خوبیوں اور ندرتوں کے ساتھ کرتے ہیں۔حالانکہ چھوٹی بحروں میں شعر کہنا تھوڑا دقت آمیز مرحلہ ضرور ہوتا ہے۔لیکن ان کے مجموعہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس پر کافی عبور رکھتے ہیں۔جہاں تک اشعار کے افاعیل کی بات ہے تو روشن لال روشن شش رکنی اور چہار رکنی بحروں میں کافی شعر کہے ہیں۔

ان کی غزلوں کا لہجہ زیادہ تند و تیز اور گھن گرج والا نہیں ہے۔ان کے اسلوب میں بڑا کٹاؤ ہے،جس کی وجہ سے لہجے کی ست روی بھی بہت تیز گام محسوس ہوتی ہے۔اس مجموعہ میں موجود غزلوں میں غیر مانوس تراکیب اور زیادہ بھاری بھر کم لفظوں کے استعمال سے پرہیز کیا گیا ہے۔بعض مقامات پر خیال اور موضوع کے آپسی تصادم سے شعر کی معنوی ترسیل مفقود ہو گئی ہے۔جو ایک قسم کا سقم ہے۔حالانکہ اس طرح کی کمیاں تقریبا سبھی شعرا کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

اس مجموعہ میں موجود غزلوں کے بعد کچھ متفرق اشعار بھی شامل کئے گئے ہیں۔کچھ قطعات کی صورت میں ہیں کچھ تین یا چار شعر کی شکل میں ہیں، جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جو غزلیں ابھی نہ مکمل تھیں اسے بھی اس مجموعہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔یہ مجموعہ ۱۴۴رصفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کا سرورق دیدہ زیبی کے ساتھ علامتی پیرایہ اظہار لئے ہوئے ہے۔

کے ساتھ مزین کیا گیا ہے۔ پس ورق کے اندرونی پیج پر رضوان احمد فارقی کے تاثرات درج ہیں اور سرورق کے اندرون پیج پر ڈاکٹر طارق قمر کی سند توثیق بھی شامل ہے ۔ اس مجموعہ میں غزلیات سے پہلے کچھ اہم قلم کاروں کے تحریری تاثرات مضامین کی شکل میں موجود ہیں۔ یہ خالص غزلوں کا مجموعہ ہے جس کی ابتدا شاعر نے "مناجات" سے کی ہے۔ اس میں کل ۲۰۸ صفحات ہیں۔ اس کی قیمت ۲۵۰ روپیہ رکھی گئی ہے۔ اور یہ کتاب "فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

"آئینہ احساس کا" اس شعری مجموعہ کے خالق شائق مظفر پوری ہیں۔ اس مجموعہ میں غزلیں، نظمیں، اور معرا نظمیں بھی موجود ہیں اور کتاب کے آخر میں مختلف موضوعات سے متعلق قطعات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی ابتدا اردو کی قدیم روایت یعنی حمد خالق کون ومکاں اور نعت سرور کونین صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ خاص کر اس مجموعہ میں "عکس احساس" کے نام سے ڈیڑھ صفحہ کا ایک تعارف نامہ بھی موجود ہے جس میں شائق مظفر پوری نے اس کتاب پر اپنے تاثرات تحریر کرنے والوں کے شکریہ کے ساتھ اپنی شاعری سے متعلق کچھ اہم معلومات بھی اپنے قارئین کے لئے فراہم کی ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب و تنظیم کا کام مہتاب انور نے ڈاکٹر افسر کاظمی اور پروفیسر سید احمد بدر کی نگرانی میں انجام دیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔ اسکی قیمت ۱۵۰ روپیہ ہے۔

"نئی زمین" یہ مجموعہ غزلیات، عمران راقم کا ہے اس مجموعہ کی فہرست سازی ایک نئے عنوان "قرینہ نئی زمین" کے نام سے کی گئی ہے۔ اس مجموعہ میں "نئی آواز سے نئی زمین تک" کے عنوان سے عمران راقم کا ایک تفصیلی مضمون بھی شامل ہے۔ اس مجموعہ میں ۹۱ غزلیں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ عمران راقم کا اس سے پہلے ایک شعری مجموعہ "نئی آواز" ۲۰۰۴ء میں شائع ہو چکا ہے، اور ایک افسانوی مجموعہ "بنجر آسمان" کے نام سے زیر ترتیب ہے۔ یہ ماہنامہ 'صورت' کولکاتہ کے مدیر ہیں۔ انھیں ان کی تخلیقات اور ادبی کاموں کے لئے دیگر اعزازات سے نوازا بھی جاچکا ہے۔

"بیاں اپنا" یہ شعری مجموعہ ہوش نعمانی کا تخلیقی ورثہ ہے۔ جس کی ترتیب و تزیین کا کام عبداللہ خالد نے انجام دیا ہے۔ اس مجموعہ کے ابتدا میں ہوش نعمانی کی شاعری اور ان کی زندگی کے بارے میں کچھ خاص ادبا و ناقدین کے تحریری تاثرات موجود ہیں ۔ اس کے بعد اس کتاب کی ابتدا کا ایک صفحہ اور کتاب کے اختتامیہ کے دو صفحات تصویر کے لئے مختص کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں موجود غزلیں اس کی تخلیقی سن اشاعت کے ساتھ ہر غزل کے اختتام پر درج کی گئی ہیں۔ اردو ادب کی دیرینہ روایت کی بنیاد پر غزلوں سے پہلے حمد اور نعت کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ کتاب کے پس ورق پر اس کتاب کے مرتب کی دیگر تالیفات و تصنیفات کا نام اور اس کی سن اشاعت درج ہے۔

"آوارہ لمحے" یہ شعری مجموعہ پی۔ پی۔ سریواستو رند کا ہے۔ اس میں کل ۴۹ غزلیں ہیں۔ غزلوں سے پہلے ڈاکٹر قمر رئیس کا ایک مضمون بھی "رند کا انفرادی لہجہ اور شعری آہنگ" کے نام سے اس مجموعہ میں شامل ہے اور یہ مضمون ۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد اس مجموعہ کی مکمل خوبیوں اور خامیوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ پی۔ پی۔ سریواستو رند کی شاعری سے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس کے مضمون کا یہ اقتباس بہت اہم ہے۔ "شاعری میں الفاظ کے ہنرمندانہ استعمال کی روایت انھیں داغ اسکول کے استاد حضرت ساغر اجمیری سے ملی ہے۔ لیکن اس روایت یا ہنر کو انھوں نے اپنی اختراعی صلاحیت سے نئی توسیع دی ہے۔ عصر حاضر کی بدلتی حسیت اور باطنی سوز و گداز کی ترجمانی کے لئے اس کی ضرورت بھی تھی۔ ورنہ ان کا کلام روایتی قالب میں ہی ڈھلا ہوا ملتا۔" جیسا کہ اس بات کا تذکرہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ کہ کسی بھی شاعر کی شاعری میں اسوقت تک دوامیت حاصل نہیں ہوتی جب تک کی اس کی بنیادی کڑی اردو کی شعری روایت سے جڑی ہونے کے ساتھ اس میں نت نئے تجربات شامل نہ کئے گئے ہوں اپنے عصری تقاضوں کی بنیاد پر۔ پی۔ پی۔ سریواستو رند کے اس مجموعہ میں شامل غزلیں اپنی تمام تر روایت پسندیوں کے باوجود اپنے اندر ایک نیا پن لئے ہوئے ہے، جس کی وجہ سے ان کے اشعار کیت و کیفیت کے جذب و قبول کے عناصر سے خالی نہیں ہوتے۔ ان کی غزلوں میں انسانی و اخلاقی اقدار کی بہترین آمیزش پائی جاتی ہے۔ لیکن ان تمام ترخوبیوں کے باوجود ان کے بعض اشعار ترسیل کے المیہ کے شکار ہوگئے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے جس کو یہاں بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

پی۔ پی۔ سری واستو رند شاعری کے میدان کے پرانے شہسوار ہیں لہٰذا وہ ان باریکیوں کو دوسروں سے کہیں زیادہ خود محسوس کر سکتے ہیں۔ "آوارہ لمحے" یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے ان کے آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) ریگ زار (۲) رگ سنگ (۳) گل رنگ (۴) شہر احساس (۵) شجر شجر چھاؤں (۶) آسماں کے بغیر (۷) طنابیں دھوپ کی (۸) جاگتی تنہائیاں، اور ان کے تنقیدی مضامین کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ صوری اعتبار سے بھی دیدہ زیب ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین کا، کام مودود علی صدیقی نے انجام دیا ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰۰۷ میں ہوئی ہے اور اس کتاب کی قیمت ۱۰۰ روپیہ درج ہے۔

''دل کی دہلیز پر''اس شعری مجموعہ کے خالق کا نام ہدایت اللہ شمسی ہے۔ یہ مجموعہ اپنی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے انتہائی دیدہ زیب ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ذریعہ شعری مجموعوں میں ،ادبا و نقاد اور دانشوروں سے لکھوائی جانے والی تقاریظ کا سلسلہ ابھی بدستور جاری ہے۔ ایک دو مجموعے کو چھوڑ کر باقی سارے مجموعوں میں شروع کے دس سے بیس صفحات خاص کر ایسی ہی تحریروں کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔ جب کہ موجودہ عہد میں اس چیز کو اچھا نہیں سمجھا جاتا اس لئے کہ کتاب شائع ہونے کے بعد لکھے جانے والے مضامین اور تاثراتی نوٹ کی اپنی ایک اہمیت و افادیت ہوتی ہے۔ لہٰذا موجودہ عہد کے بزرگ شعراء وادباء اب اس سے حتیٰ الامکان پرہیز کرتے ہیں کہ ان کے مجموعے میں کسی کی ستائشی تحریر شامل ہو۔ لیکن اکثریت ترقی پسند تحریک کی قائم کی ہوئی اس روایت کو ابھی بھی قابل اعتنا گردانتے ہیں۔ بہر حال اسے تخلیق کار کی اپنی ذاتی پسند و ناپسند پر محمول کرنا چاہئے۔

مذکورہ مجموعہ کی ابتدا میں تقاریظ کا ایک طوالانی سلسلہ ہے۔ یہ شعری مجموعہ مکمل غزلیات پر ہی مشتمل ہے۔ لیکن اس میں ایک باب متفرقات کے نام سے بھی شامل ہے جس میں نعت کے علاوہ شخصی نظمیں بھی مختلف عناوین کے تحت شامل کی گئی ہیں۔ اس مجموعہ کا آخری حصہ میں قطعات کو رکھا گیا ہے۔ اسکی انفرادیت دیگر مجموعوں کی مناسبت الگ یوں ہے کہ اس میں آخر کے ۸رصفحات ''یادداشت'' کے عنوان سے مختص ہیں۔ اس لئے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے قارئین اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات کو قلم بند کرسکیں ۔ یہ طریقہ کار کافی بھلا معلوم دیتا ہے۔ یہ مجموعہ اپنی طباعت اور جملہ تلازمات کی مناسبت سے قابل دید ہے۔ یہ مجموعہ یادداشتی صفحات کو ملاکر کل ۲۷۲رصفحات پر مشتمل ہے۔

''آنسو'' یہ شعری مجموعہ اسلم ملک کا ہے۔ اس مجموعہ کی سب اچھی بات یہ ہے کہ اس مجموعے کو ستائشی تقریظات سے پاک رکھا گیا ہے۔ تخلیق کار نے بقلم خود ۹رصفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ لکھا ہے، جس میں انھوں نے اپنا تعارف اور دیگر کوائف زندگی کے علاوہ اپنی شاعری سے متعلق بھی کچھ اہم معلومات اپنے قاری کے لئے فراہم کی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلم ملک بنیادی طور سے نظم کے شاعر ہیں۔ کچھ غزلیں بھی ہیں لیکن وہ نا کے برابر ہیں۔ انھوں نے نظمیں مختلف عنوان کے تحت لکھیں اور اس میں شخصی مرثیہ بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ نعت کو بھی اپنے رزق سخن کی برکت کے لئے اس مجموعہ میں شامل کیا ہے۔ یہ مجموعہ ۲۴۰رصفحات ہر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب و تدوین کا کام خود تخلیق کار نے کیا ہے۔ اس کی اشاعت دسمبر ۲۰۰۶ء میں عمل پذیر ہوئی۔ اس مجموعہ میں قیمت درج نہیں ہے۔

'بچوں کی بیت بازی' کے مصنف حافظ کرناٹکی ہیں۔ یہ کتاب خاص کر بچوں کی ذہنی نشوونما اور ان کی ذہن سازی کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس بات کے اعتراف میں ہمیں قطعی تکلف نہیں کہ موجودہ عہد میں اطفال ادب کے نام پر بہت کم لکھا جارہا ہے، یا جو لوگ لکھ رہے ہیں۔ ان کی ستائش اور پذیرائی بھی اس طریقے سے نہیں ہورہی ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ اس لئے کہ کوئی بھی تخلیق کار اس وقت بچوں کے ادب کو تخلیق نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ بچوں کے نفسیات سے واقف نہ ہو۔ شاید انھیں وجوہات کی وجہ سے تخلیق کار اس میدان میں خامہ فرسائی کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن حافظ کرناٹکی جیسے تخلیق کار اس بات کو اچھی طرح سے سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ اردو کا مستقبل انھیں بچوں کی تربیت اور ان کے ادبی ذوق کی آبیاری پر منحصر ہے اگر انھیں نظر انداز کیا گیا تو ہماری زبان اپنی ایک صحت مند ادبی روایت سے محروم ہوجائے گی۔

حافظ کرناٹکی نے خاص طور سے اس کتاب کو مدرسوں، اسکولوں اور کالجوں میں بچوں کے لئے ہونے والے بیت بازی کو بنیاد بنا کر تحریر کی ہے۔ اس کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں حافظ کرناٹکی نے ایسے سادہ اور سلیس اشعار تحریر کئے ہیں، جو بچوں کو جلد ذہن نشین ہوجائیں اور ان کی ادائیگی میں بچوں کو کسی طرح کی قباحت نہ ہو، اور اس میں اردو کے حروف مقطعات کے حساب سے اشعار تخلیق کئے گئے ہیں یعنی ''الف سے'' ''ی'' تک۔

حافظ کرناٹکی نے ادب اطفال پر کافی کام کیا ہے۔ انھوں نے بچوں سے متعلق تقریباً ۳۵رکتابیں مختلف عنوان سے تخلیق وترتیب کی ہیں۔ ''معصوم ترانے'' ''مہکتی کلیاں'' ''بلبلوں کے گیت'' ''زمزمے'' ''چمکتے ستارے'' ''گلشن گلشن شبنم شبنم'' ''چاند گہن'' ''طفلستان'' ''ہندوستان (قومی گیت) وغیرہ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے ذریعہ اردو پڑھنے لکھنے اور بولنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے اندر موجود ادبی شعور کو بیدار کرنے میں بھی ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہیں ۔ چونکہ بچوں کی ذہن سازی کا کام اگر بچپن سے ہی کیا جائے تو آگے چل کر اس سے نہ صرف اردو زبان کا فائدہ ہوگا بلکہ ہمارے ادب کو بھی غیر یقینی فائدہ حاصل ہوگا۔ یہ کتاب ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس کتاب کے آخر میں مصنف کی دیگر تخلیق کا نام بھی درج کیا گیا ہے۔

(مبصر: شاہد کمال)

آپ کے خطوط

آپ کوادارت کاایک سال بہت بہت مبارک ہو۔آپ نے اس ایک سال میں نیا دور کوخوب سے خوب تر بنادیا۔

میرا افسانہ ادھورے خواب شائع کرنے کے لیے بہت بہت شکریہ۔

یہ کیا محترم ہم نے سوچا تھا ہمارا بھی مختصر تعارف شائع ہوگا لیکن مایوسی ہوئی۔اداریہ پڑھا تو آپ کا درد معلوم ہوا۔ بھائی ہر اچھے کام کے لیے پریشانیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ان کی وجہ سے اچھا کام بند نہیں ہونا چاہیے یہ میری ناقص رائے ہے۔اگر آپ یہ طے کرلیں کہ بنا تعارف کے تخلیق شائع نہیں ہوگی تو ممکن ہے آپ کی کچھ پریشانی کم ہوجائے۔اچھا سلسلہ ہے ختم مت کیجئے۔

اگر یہ سلسلہ دوبارہ شروع کریں تو مئی کے شمارے کے مصنفین کا تعارف ضرور شائع کریں۔

محمد قمر سلیم

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش کا مذکورہ ماہنامہ نیادور اپنے آپ میں ایک سرکاری سوینئر ہے جو عوام کے لئے رفاہی و فلاحی اعتبار سے اپنی گوناگوں پالیسیوں کے تحت بحسن وخوبی خدمت انجام دے رہا ہے لیکن ثقافتی لحاظ سے ماہنامہ اردو ادب کا ایک مہر منور کا مصداق بھی ہے۔اس کے عام شماروں کی بہ نسبت خصوصی شماروں کا اشاریہ یہاں تحریر کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔منجملہ تمام خصوصیات کے پیش نظر آنجناب کی بحیثیت مدیر کے شرکت اس کے حلقۂ ادارت میں کرشماتی امر ہے۔

ٹکنالوجی کے اس تیز رفتار زمانہ میں اردو کے قارئین کی دلچسپیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس ماہنامے کو انفرادی طور سے جو Look دیا ہے وہ آپ کی صحافتی بصارت کو اجاگر کرتا ہے۔آپ کی اس پیشرفت کی گونج یقیناً اردو بستیوں کے حلقۂ ادب میں تادیر سنائی دے گی۔ نئے تخلیق کاروں کی ادبی کاوشوں کو اشاعتی موقع فراہم کرانے میں ان کی شناخت کی پیش قدمی کو لائق تحسین تصور کیا۔اس اقدام کیلئے مبارکباد قبول فرمائیں۔

بسم اللہ عدیم برہانپوری

(برہان پور، ایم پی)

نیا دور کا بے حد جاذب شمارہ نظر نواز ہوا۔ کور پیج کے ساتھ ساتھ اندر کے صفحات بھی قاری کو متاثر کرنے کے لئے کافی ہیں۔آپ کی ادارت میں رسالے کا معیار کافی اچھا ہوا ہے بلکہ مضامین کے لحاظ سے بھی جونئی تبدیلی لائی گئی ہے وہ رسالے کے معیار کی غماز ہے۔ بشیر بدر اور ندا فاضلی پر مشتمل فروری کا شمارہ بیحد معلوماتی، دلچسپ اور تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مالتی جوشی نے ندا فاضلی اور راحت بدر نے بشیر بدر کی زندگی پر خوبصورت انداز میں بھرپور روشنی ڈالی ہے جب کہ دیگر مضامین بھی قابل تعریف اور معلوماتی ہیں۔شمارے کے مشمولات میں زیبا محمود صاحبہ کا مضمون 'ندا فاضلی کی شعری کائنات اور اس کے مخصوص معنوی تلازمات وتعلیقات' غالباً ۲۰۱۳ء میں امراوتی، مہاراشٹر کے رسالہ 'اردو' کے ندا فاضلی نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ دوبارہ اس کی اشاعت نیا دور میں دیکھ کر حیرت ہوئی اور مضمون نگار کی حرکت پر افسوس بھی۔ عام قاری کی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر مضامین کی اشاعت قابل تعریف ہے مگر غیر مطبوعہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی تعداد میں اضافہ کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر تنویر آزاد

گڑی اسٹریٹ،ظہیر آباد،سنگریڈی (ٹی ایس)

مئی ۲۰۱۸ء کا شمارہ موصول ہوا۔آپ کی ادارت کو ایک سال مکمل ہوگیا۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔آپ نے اس ایک سال کی قلیل سی مدت میں رسالے کے معیار میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

گزشتہ کے شماروں مضامین کی بہتات ہوتی تھی۔آپ نے انہیں ختم کرکے بلکہ ان پر لگام لگاتے ہوئے معیاری اور ضروری مضامین کی اشاعت کو ترجیح دی اور دیگر بہت سے ایسے کالم شروع کئے جو نیا دور کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ تھے۔بازدید، ہندوستانی ادب، غیر ملکی ادب، ہندی کہانی، طنز ومزاح وغیرہ جیسے کالم کافی اہمیت کے حامل ہیں اور مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

آپ نے قلمکاروں کو بقول آپ کے اسٹار ٹریٹمنٹ سے بھی نوازا جس کے لئے آپ تعریف کے حقدار ہیں۔اردو کے رسالوں میں اس طرح کا سلسلہ پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ یہ کافی بہتر تھا مگر افسوس کہ ناقدری کی بنا پر اسے بند کردینا پڑا۔ اس سے سب سے زیادہ فائدہ ان قلمکاروں کو پہنچتا تھا جو اس میدان میں نئے ہیں خاص کر یونیورسٹی کے طلباء وغیرہ اور نئے افسانہ نگار وغیرہ۔

مئی کے شمارے میں سلام بن رزاق کا افسانہ بہترین ہے۔ اور جے ایم سالی کی کہانی عکس بھی بہترین ہے۔ اس کے علاوہ بھی سارے افسانے مطالعہ کے لائق ہیں۔ اردو ادب میں نکڑ ناٹک کی روایت پر داؤد احمد نے کافی محنت نے کی ہے مگر کچھ تشنگی سی رہ جاتی ہے۔اس میں مزید تحقیق کی ضرورت درکار ہے۔آغا حشر کاشمیری کی ہمہ جہت شخصیت پر مضمون پڑھ کر دلی تسلی ہوئی۔گزشتہ لکھنؤ کے تحت مرزا جعفر حسین کا تو جواب ہی نہیں۔امید ہے یہ رسالہ اسی طرح ترقی کی راہیں طے کرتا رہے گا۔

رانجہ تقوی

(درگاہ روڈ،لکھنؤ)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی گورکھپور میں عوام کے مسائل سنتے ہوئے (۱۳رمئی ۲۰۱۸ء)

وزیر ریاست برائے اطلاعات جناب نیل کنٹھ تیواری لوک بھون، لکھنؤ میں شمع روشن کرکے سوشل میڈیا ورکشاپ کا
افتتاح کرتے ہوئے، ساتھ میں ہیں، پرنسپل سکریٹری اطلاعات جناب اونیش اوستھی اور ڈائرکٹر اطلاعات ڈاکٹر اتول کمار (۱۱رجون ۲۰۱۸ء)

ڈائرکٹر اطلاعات ڈاکٹر اتول کمار لوک بھون آڈیٹوریم، لکھنؤ میں منعقد سوشل میڈیا ورکشاپ پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے (۱۲رجون ۲۰۱۸ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स स0 146,
लखनऊ — 226 001

نائب صدر جمہوریہ ہند جناب وینکیا نائیڈو لکھنؤ میں جناب لال جی ٹنڈن کی کتاب (انکہا لکھنؤ) کی رسم اجراء کے پروگرام کا شمع جلا کر آغاز کرتے ہوئے۔ ساتھ میں ہیں اترپردیش کے گورنر جناب رام نائیک، وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی اور نائب وزیر اعلیٰ ڈاکٹر دنیش شرما (۲۶ مئی ۲۰۱۸ء)

نائب صدر جمہوریہ ہند جناب وینکیا نائیڈو لکھنؤ میں واقع اترپردیش بجلی تعمیر کارپوریشن لمیٹیڈ کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر ساتھ میں ہیں اترپردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی (۲۶ مئی ۲۰۱۸ء)

نیادور کے شمارے اب A.H. Wheeler لکھنؤ کے سبھی بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہیں

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

वर्ष : 73 अंक 02
जून 2018
मूल्य : 15 रु./—
वार्षिक मूल्य : 165 रु./—

पंजीयन संख्या : 4552 / 51
एल0 डब्लू / एन0 पी0 / 101 / 2006—08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, **डॉ0 उज्ज्वल कुमार**, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ—226001 से प्रकाशित—सम्पादक, **सुहेल वहीद**